قومی زبان

اپریل 2009

بیادِ علامہ اقبال

سرسید احمد خاں، حالات وافکار

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو، سرسید احمد خاں کے شاگرد خصوصی تھے۔ اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے سرسید احمد خاں کو چلتے پھرتے تاریخی، علمی کارنامے انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے اس سے نئی نسل کو بھی اُسی انداز میں آگاہ کریں۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی باقیات کو دہلی سے لاکر کراچی میں مجتمع کیا اور انجمن کے بے جان اور ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونکی۔

۱۹۴۹ء میں اردو کالج قائم کیا۔ بعد میں اردو کالج کے پرنسپل اور اُن کے نامزد کیے ہوئے شرکائے کار نے بابائے اردو کے خلاف جو سازشیں اور غیر اخلاقی و غیر انسانی برتاؤ کیا وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بقلم خود اس کا تفصیلی احوال بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان، اپریل ۲۰۰۹ء، جلد ۸۱، شمارہ: ۴

ادارۂ تحریر

اداجعفری

جمیل الدین عالی

مُدیر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۵ روپے

سالانہ صرف رجسٹری سے ۳۰۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

اداریہ		۳
فکرِ اقبال کے جدید پہلو	پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی	۵
پیامِ مشرق کی نظم ''تسخیرِ فطرت''.....	ڈاکٹر شاہدہ یوسف	۱۵
شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال	روحی طیبی	۱۸
مغرب کے سیاسی نظام اقبال کی نظر میں	سید شیراز علی زیدی	۳۰
کتاب ''اقبال اور عشقِ رسولؐ'' کا مطالعہ	ڈاکٹر سید وسیم الدین	۳۶
اقبال کی قدر و قیمت	محمد تقی خان	۳۹
راشد کی تین نظموں کا متنی اشتراک	نسیم عباس احمر	۴۳
حفیظ جالندھری — ایک منفرد گیت نگار	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن	۴۷
ابن انشا کی یاد میں	ناصر شمسی	۵۹
یوٹوپیا کی کہانی	سلیم صدیقی	۶۲
اردو کی جدت طرازی اور اہمیت	مجید خان لودھی	۶۷
ڈاکٹر مہر عبدالحق کی یاد میں	ڈاکٹر اسد فیض	۶۹
نثارِ عزیز بٹ کے ناولوں کے کردار	ممتاز احمد خان	۷۲
رفتارِ ادب		۷۷
گردوپیش		۸۴

BRANDS iCON
OF PAKISTAN
2008
Brands Icon Award 2008 given to Rooh Afza
کامیابی کا یہ قصّہ نیا نہیں
پھر بھی اتنا ہی تازہ ...
اور اس سال Brands Icon Award کا اعزاز اس قصّے کا ایک تازہ ترین باب ہے
جو کہ پاکستان کے صرف سات منفرد برانڈز کو نوازا گیا ہے۔
ایک ایسے برانڈ کے لئے جس نے سو سال سے اپنے اعلیٰ معیار کو مسلسل برقرار رکھا ہوا ہے
یہ اعزاز جیسے روز کی بات ہو۔ گو کہ ہر بار یہ خبر اتنی ہی تازہ ہوتی ہے جیسے کہ دنیا کا سب سے
بہترین روایتی مشروب ... روح افزا
Brands of the Year Award 2008
Consumers Choice Award 2008
Merit Export Award 2007-2008
Brands of the year Award 2008
WWW.BRANDSAWARD.COM
ہمدرد لیباریٹریز (وقف) پاکستان
Tel: (009221) 6616001-4, E-mail: headoffice@hamdard.com.pk, www.hamdard.com.pk
Blitz DDB

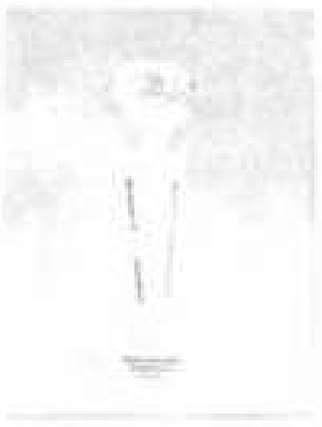

اداریہ

اپریل اور نومبر دو ایسے مہینے ہیں جنھیں ہم نے اقبال کے لیے مختص کیا ہوا ہے۔ اقبال ہمارے ان کلاسیکل شعرا میں شامل ہیں جو اپنے عہد سے بہت آگے کی آواز تصور کیے جاتے ہیں۔ غالب انیسویں صدی کے ناقابل فراموش شاعر تھے اور اقبال نے بیسویں صدی کو متاثر کیا تھا۔ سب واقف ہیں کہ کلاسیکل اہمیت کے حامل شاعر اور ادیب اپنے عہد سے ماورا ہوتے ہیں اور ان کی آواز آنے والے ہر عہد میں سنائی دیتی ہے۔ ان کی تحریریں ہمیشگی کی حامل ہوتی ہیں۔ مثل مشہور ہے۔

A Classic goes on telling what it has to say

اقبال کے کلام نے اس دور میں اپنا جادو جگایا جب کہ قوم انتہائی مایوسی اور بے یقینی کا شکار تھی، ان کو رہنمائی اور سمت کی ضرورت تھی۔ صرف ایسے ہی موقع پر ایسے یگانۂ روزگار ادیب کی ضرورت ہوتی ہے جو امید کے چراغ روشن کردے۔ آپ اقبال کے پورے کلام کو پڑھ جایئے، ہر جگہ قارئین کو ایک پیغام ملے گا اور وہ ہے حالات خواہ کیسے ہی ہوں امید کا دامن تھامے رہیے، مایوسی کو اپنے قریب نہ آنے دیجیے، باعمل بنیے، شب تیرگی کا مقابلہ کیجیے تا کہ روشن صبح کی تخلیق ہو سکے۔ اس طرح اقبال انسان کو اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کا احساس دلاتے ہوئے اسے اپنی اصلاح کرنے اور معاشرے میں مثبت و تعمیری انقلاب لانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اقبال عظمت آدم کے تصور کے نقیب ہیں۔ وہ شر EVIL کو رد کرتے ہوئے خیر GOOD کا پرچم بلند کرتے نظر آتے ہیں اور امید HOPE کو فلسفیانہ رُخ عطا کرتے ہیں۔ اپنی مخصوص فکر کی بنیاد پر وہ ہمارے سماج اور ادب میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۲۔انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۳۔سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۴۔کہانی رانی کیتکی	میر انشا اللہ خاں انشا	70/-
۵۔فنی تنقید	خلیق انجم	300/-
۶۔حرفے چند (جلد چہارم)	جمیل الدین عالی	250/-
۷۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اوّل، جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	550/-
۸۔اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۹۔غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۰۔جدید اور مابعد جدید تنقید	ناصر عباس نیر	300/-
۱۱۔غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۲۔ممتاز حسن احوال و آثار	فرزانہ ناہید گیلانی	225/-
۱۳۔غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	350/-
۱۴۔اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۱۵۔پاکستان میں اردو دوہے کی روایت	کنول ظہیر	250/-
۱۶۔انجمن ترقی اردو پاکستان کی مطبوعات (توضیحی کتابیات)	محمد اشرف کمال	250/-
۱۷۔زخ ش حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر فاطمہ حسن	250/-
۱۸۔اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	300/-
۱۹۔اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	بابائے اردو مولوی عبدالحق	80/-
۲۰۔محمد حسین آزاد (جلد دوم)	ڈاکٹر اسلم فرخی	375/-
۲۱۔غالب کے خطوط (جلد اوّل)	خلیق انجم	240/-
۲۲۔عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	250/-

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔۷۵۳۰۰

آرٹس کونسل میں منعقدہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب میلے کا افتتاح
سندھ اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر محترمہ شہلا رضا کر رہی ہیں

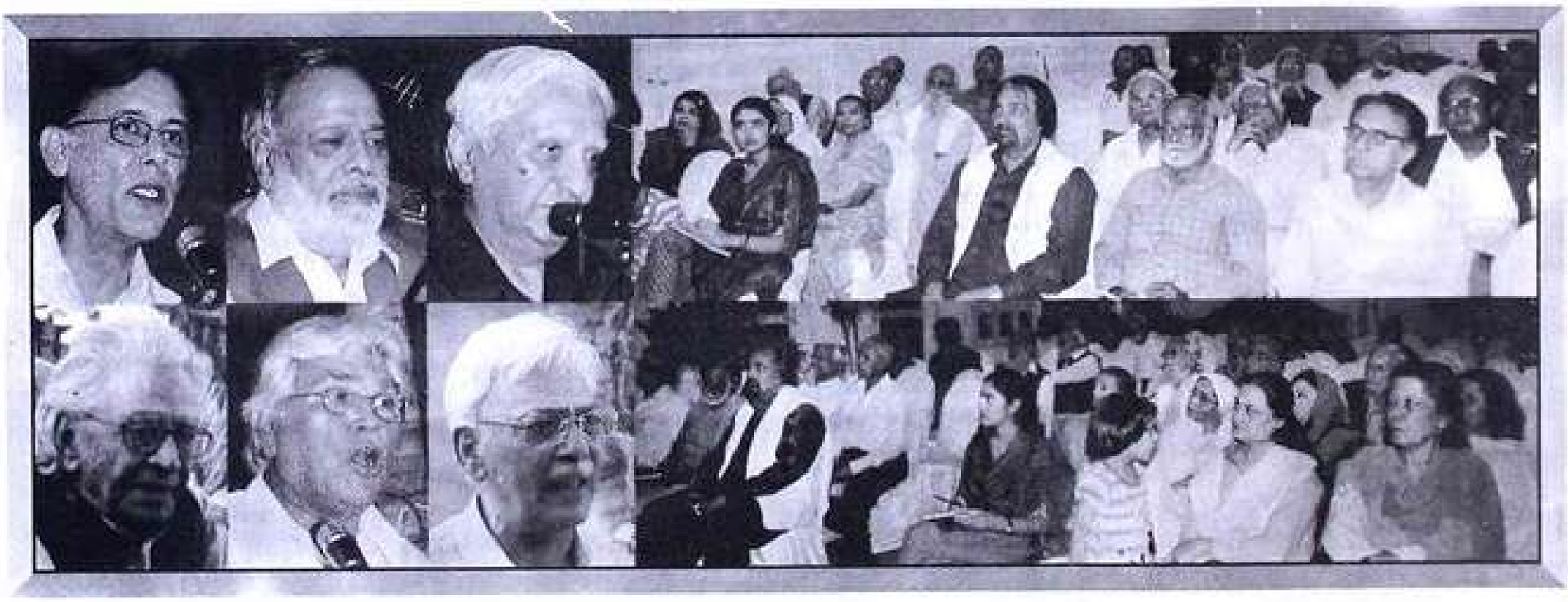

"بیادِ رفتگاں" کے سلسلے میں محترم تابش دہلوی اور ابن انشا پر منعقدہ تقریب سے صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان،
اُمراؤ طارق، سعود تابش، ناصر شمسی، خواجہ رضی حیدر اور سرشار صدیقی خطاب کر رہے ہیں

چینی ادیبوں کے دورہ انجمن کے موقع پر لیا گیا گروپ فوٹو

(دائیں سے بائیں) حسن ظہیر، آغا نور محمد پٹھان (اکادمی ادبیات، سندھ) چینی ادیب، اظفر رضوی، چینی ادیب، آفتاب احمد خان (صدر انجمن)، فرسٹ سیکریٹری سفارت خانہ جمہوریہ چین، چینی ادیب، ظہیرالدین ملک (ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیاتِ پاکستان)، ڈاکٹر جعفر احمد (ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈیز سینٹر، جامعہ کراچی)، اُمراؤ طارق

پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی☆

فکر اقبال کے جدید پہلو

اقبال نے جرمنی کے مشہور گوئٹے سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا:

او چمن زادے، چمن پروردہ
من دمیدم از زمین مردہ

مگر عجیب بات ہے کہ اس زمینِ مردہ سے تین گلہائے سرسبد پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنی نواہائے گرم سے اپنے عہد کے تہذیب وتمدن اور تعلیم وتربیت کو متاثر کیا۔ میری مراد ہے بیدل، غالب اور اقبال سے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بیدل کا انفس وآفاق کا مشاہدہ گہرا ہے اور ان کی شاعری حکیمانہ تفکر کی حامل ہے۔ اسی لیے غالب نے بیدل کو بحر بیکراں اور محیط بے ساحل کہا ہے۔ گوئٹے کے افکار پر حافظ، سعدی، فردوسی اور عطار کی تخلیقات کا اثر ہے۔ اس کا اشارہ اقبال کے اس شعر میں ملتا ہے:

پیر مغرب شاعر المانوی
آن قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی

غالب اپنے آپ کو ایران کے شعرا عرفی، نظیری، ظہوری، صائب، طالب اور کلیم کے زمرے میں شامل کرتے تھے۔ مگر دانائے ضمیر کائنات، علامہ اقبال نے کبھی تعلّی سے کام نہیں لیا۔ ان کو اپنے کلام پر زعم نہیں تھا۔ وہ علم کے متوالے تھے اور عظمت فکر کے آئینہ دار۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے مقابلے میں ان کی فکر بلند سے بلند تر پرواز کر سکتی ہے۔ وہ احترام انسانیت کے شاعر تھے اور عظمت آدم کے نقیب۔ اقبال نے مغربی افکار وخیالات کا مطالعہ کیا اور قوم کو مقام انسانیت سے آگاہ کیا:

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب، احترام آدم است

(جاوید نامہ)

☆شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

اسی طرح بال جبرئیل کے اشعار بیسویں صدی کے انسان کی بھرپور اور پُراعتماد وہ آواز ہے جو کلبلائی ہوئی انسانیت کو دکھوں سے نجات دلانا چاہتی ہے۔

انھوں نے فطرت کے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ انسان ایک بندۂ آزاد ہے۔ وہ کسی کی غلامی کرنے کے لیے نہیں آیا۔ انسان اپنی بے بصری سے اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ اس لیے وہ تمام بتوں کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو مذاہب کے درمیان رواداری کو مٹاتے ہیں اور خوئے غلامی کو فروغ دیتے ہیں:

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود فگرے پیدا شد

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابوالکلام کو جو شہرت دوام ملی تو وہ عشق قرآن سے اور اقبال نے جو گوہر آبدار سمیٹے تو وہ عشق رسولؐ سے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت تھی۔ ذکر رسول سے ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے تھے۔ یہ ان کا عشق رسولؐ ہی تھا جس نے ان کے کردار کی تعمیر کی اور ان کے عقائد کو پختہ کیا اور ان کے دامن کو گہر ہائے آبدار سے مالا مال کیا اور وہ برہمن زادہ ہو کر کاشفِ اسرار و رموز فطرت بن سکے۔

علامہ اقبال نے قوم کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ خودی اور خودداری کا سبق دیا۔ غلامی کی زنجیریں اور رہبانیت کا فسوں توڑا۔ علم و عمل کی طرف مائل کیا۔ وہ بادۂ تصوف کے مے خوار تھے۔ مگر ان کے خیال میں تصوف میں غیر اسلامی عنصر کی شمولیت نے اصلی رنگ کو بگاڑ دیا۔ ان کہنا ہے کہ اصل تصوف، بایزید بُسطامی، سلمان فارسی اور ذوالنون مصری کا ہے بعد میں تصوف میں بدھ مت، ہندو مذہب اور ویدانت کے نوافلاطونی عناصر شامل ہوئے اُن سے تصوف کو پاک ہونا چاہیے۔

وحدت الوجود، تصوف کی ایک طرز فکر ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں۔

ایک ہمہ اوست اور دوسرے ہمہ از اوست۔ ہمہ اوست کا مطلب یہ ہے کہ خدا موجود ہے۔ خدا اور انسان متحدہ الوجود ہیں یا عینِ یک دیگر ہیں۔ ہمہ از اوست کا مفہوم کہ خدا کے علاوہ انسان بھی موجود ہے۔ لیکن اس کا وجود ظلّی ہے۔ اصلی نہیں ہے۔ کیوں کہ انسان قائم بالذات ہے۔ جیسے درخت اور اس کا سایہ۔ اسی طرح تمام ممکنات کا وجود ظلّی ہے۔ وحدت الوجود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اسلامی دوسری غیر اسلامی۔ اسلامی کی دو تعبیریں ہیں۔ ایک شیخ محی الدین ابن عربی کی اور دوسری شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی کی۔ جس کو وہ وحدت الشہود کہتے ہیں۔ شیخ اکبر اور مجدّد الف ثانی دونوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ اور ممکنات کا وجود ظلّی ہے۔ مگر شیخ اکبر کا کہنا یہ ہے کہ ظلّی موہوم ہے اور مجدّد الف ثانی فرماتے ہیں کہ یہ ظلّی موجود ہے۔ وجودی صوفیاء کا مسلک یہ ہے کہ حق تعالیٰ، وجود مطلق ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو بھی وجود حقیقی وجود

حاصل نہیں۔ ساری کائنات وجود باری کا ظل یا عکس ہے۔ حاکم کا وجود ظلی ہے حقیقی نہیں ہے۔ بیدل اور غالب، ابن عربی کا تتبع کرتے ہیں۔ جب کہ اقبال مجدّد الف ثانی کے پیروکار ہیں۔ اقبال، بیدل اور غالب سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو برقرار رکھے۔ لیکن اپنے اندر خدا کی صفات کا رنگ بھی پیدا کرے۔ جیسے لوہا گرم ہو کر اپنے اندر آگ کے خواص پیدا کرتا ہے۔ اس لیے انسان اپنی خودی کو برقرار رکھے اور خدا جیسی صفات پیدا کرے:

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیآموز

از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ لاموجود، الّا اللہ اوست

بیدل، غالب اور اقبال، جن کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب دونوں فلسفوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے۔ اقبال کے ہاں فلسفہ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور شاعری کا مرتبہ ثانوی ہے، جب کہ بیدل اور غالب کے ہاں صورت برعکس ہے۔ اقبال، کندی، فارابی، ابن سینا، ابن عربی کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں، جب کہ بیدل اور غالب کے ہاں کوئی مربوط فلسفۂ حیات نہیں۔ اقبال ایک مربوط ضابطۂ حیات کے ترجمان ہیں اور وہ ضابطۂ حیات ہے قرآن اور اسلام۔ اس اعتبار سے اقبال پہلے فلسفی ہیں اور بعد میں شاعر۔ شاعر سے وہ ابلاغ کا کام لیتے ہیں:

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بیدل اور غالب پہلے شاعر ہیں اور بعد میں فلسفی۔ اقبال، حقائق و واقعات کی روشنی میں کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ غالب ذاتی احساسات کے ذریعے دنیا کو پرکھتے ہیں۔ اقبال کا طائر فکر، حکمت اور فلسفہ کی بلندیوں پر سرگرمِ پرواز رہتا ہے۔ غالب نے اقبال کی طرح کسی دنیا کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پہلے فنکار ہیں اور بعد میں حکیم۔ ایک بات جو غالب اور اقبال میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں رجائی شاعر ہیں۔ اقبال مصائب اور مشکلات سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ زندگی کا لطف ان سے مقابلہ کرنے میں ہے اور ان سے مایوس ہونے میں نہیں۔ غالب کا کوئی مربوط فلسفہ نہ تھا۔ جیسا کہ اقبال کا فلسفہ خودی ہے۔ غالب کے ہاں بھی فلسفیانہ اشعار ہیں مگر وہ بیدل کا اثر ہے۔ غالب کے ہاں خیال اور جذبات کا امتزاج ہے۔ جو ان کے عقلی تجربات، شاعرانہ احساسات اور فنی شعور کو نکھار سکا۔ مگر ان کی

شاعری میں وہ فلسفیانہ تعلق پیدا نہ ہو سکا جو اقبال کے ہاں ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غالب نے اقبال کی طرح فلسفہ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اقبال کے ہاں فلسفہ کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیمات بھی ہیں جس کے لیے انھوں نے مولانا روم کو اپنا پیرو مرشد بنایا:

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

زندگی ایک لامتناہی شئے ہے۔ جو نہ کبھی فنا ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے امروز فردا سے ناپا جا سکتا ہے۔ زندگی ستاروں کی مانند ہے۔ وہ ستارے جو حباب کی طرح بنتے بھی ہیں اور مٹتے بھی ہیں وہ بلند کوہسار کی چوٹی کو چھوتے ہوئے بارش کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ زندگی رواں دواں ہے۔ چمن میں پھول آتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں اور پھر نئی بہار دکھاتے ہیں جس طرح بلبل کا چہچہانا اور دریا کا بہنا مسلسل ہے۔ اقبال اسی تسلسل حیات کے قائل ہیں۔

اقبال، علم، عشق اور عقل کی طاقتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ علم کے جویا ہیں اور عشق کے پرستار، وہ علم سے دماغ کو روشن کرتے ہیں اور عشق سے دل کی رہنمائی کا کام لیتے ہیں وہ خالص علم یا عقل پر زور نہیں دیتے بلکہ عقل اور عشق دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ کیوں کہ علم کے بل پر رازی فلسفہ کو ڈور سلجھاتے رہے مگر سرا نہ ملا:

گرہ کشا نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اسی طرح امام غزالی نے علم حاصل کیا تو دل کو چین نصیب نہ ہوا۔ بصارت کی آنکھ بند کی اور بصیرت کے میدان میں آئے۔ عشق و نظر کو اختیار کیا۔ تو دل کو چین ملا۔ علم کی کامیابی کے لیے سپاہِ عشق کی ضرورت ہے۔ علم بغیر عشق کے طاغوتی طاقت ہے اور اگر علم، عشق کے ساتھ ہو تو لاہوتی قوت بن جاتا ہے:

علم بے عشق است از طاغوتیان
علم باعشق است از لاہوتیان

اقبال کا کہنا ہے کہ علم حقیقت قدرت الٰہی ہے جو کائنات کے خارجی اور ذہنی تصورات مہیا کرتا ہے۔ انسان کو جو فرشتوں پر فوقیت ملی وہ علم ہی کی وجہ سے ملی۔ قرآن نے کہا ہے عَلَّمَ الآدمَ اسماءَ کُلّھا۔ مگر اقبال علم کے ساتھ دولتِ عشق کے بھی طالب ہیں کیوں کہ عشق سے فکر میں نکھار آتا ہے اور گفتار میں شیرینی اور کردار میں پختگی آتی ہے۔ علم مصوری کی طرح ہے جو ہر چیز کی تصویر ہو بہو کھینچ دیتا ہے۔ علم ایک آئینہ ہے، علم سے انسان تحقیق اور جستجو میں مصروف ہوتا ہے۔ نامعلوم کو معلوم کرتا ہے اور حکمت کے موتی رولتا ہے۔ مگر عشق کا درجہ پھر بھی علم سے بلند ہے:

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب

علم دولت عشق سے بہرہ مند ہو تو زور پکڑتا ہے۔ ورنہ وہ خیالی نیام کی طرح ہے۔ علم فقیہ و حکیم بن سکتا ہے مگر دانائے راز نہیں

بن سکتا۔ وہ روشنی کا جویا تو بن سکتا ہے مگر سراپا روشنی نہیں۔ سراپا روشنی بننے کے لیے علم کو عشق کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رومی، عشق کے زور سے جیتے اور بو علی سینا معقولات کے گرد و غبار میں پھنس کر رہ گئے۔ امام غزالی فلسفہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے اور رازی عقل کی راہ میں مقامِ خبر تک پہنچ گئے مگر مقام نظر حاصل نہ کر سکے۔

رومی اور اقبال علم کو اہمیت دیتے ہیں۔ مگر نظر اور بصیرت کو علم سے بہتر مانتے ہیں علم سے کائنات کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔ علم ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے۔ اور بحر و بر اور ماہ و خورشید کو مسخر کر سکتا ہے۔ مگر دلوں کو مسخر کرنے کے لیے علم کی نہیں عشق کی ضرورت ہے۔ دل کا سکون، عشق سے ملتا ہے۔ دل کا سکون اصل چیز ہے۔ دل کی بربادی، اصل حیات نہیں:

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ

کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

خرد، نمرود فرعون ہے اور عشق، خلیل و شعلۂ طور ہے۔ خرد، فرنگیوں کی طرح عیار ہے۔ وہ سو بھیس بدل لیتی ہے اور روباہی سکھاتی ہے۔ عشق، خرد کو راستہ دکھاتا ہے اور اس کو راز ہائے درون فطرت کے اسرار و رموز بتاتا ہے۔ عشق سے خودی اور خود آگاہی کا استحکام ہوتا ہے۔ دنیا کی رونق عشق سے ہے۔ اگر حرف عقل کی کارفرمائی ہوتی تو عالم تہہ و بالا ہو جاتا:

نبود ۔۔۔ عشق و ایں ہنگامۂ عشق

اگر دی چونِ خرد، فرزانہ بودے

دنیا عقل کی نگاہ میں کچھ ہے اور عشق کی نظر میں کچھ ہے۔ اقبال، عشق کے بارے میں مولانا روم کے پیروکار ہیں اقبال، عقل کو چراغ راہ تصور کرتے ہیں۔

وہ منزل نہیں ہے۔ کیوں کہ خرد، سُر میں بُت خانہ بناتی ہے۔ عشق اسے حرم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عشق مٹی کے پیالے کو جامِ جم بناتا ہے۔ جو کام عقل نہیں کر سکتی اس کو عشق مکمل کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق کا محور اور مرکز دل ہے۔ عقل، عشق کی ضد نہیں۔ بلکہ اس کے تابع ہے۔ عشق سے عقل کا راستہ تو پورا کیا جا سکتا ہے۔ مگر عقل سے عشق کا راستہ طے کرنا، آفتاب کو چراغ دکھانے کی طرح ہے:

بہ خرد، راہِ عشق می پوئی

بہ چراغِ آفتاب می جوئی

عقل و عشق ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ البتہ دونوں کے طریق الگ الگ ہیں۔ لیکن عقل میں عشق والی جرأت رندانہ نہیں ہے۔

عشق و عقل کی اس بحث کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں عشق، روایتی عشق ہے۔ اقبال کے ہاں وجدانی دونوں کے ہاں عشق کی کیفیت مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال جرمن فلاسفر کانٹ کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ تنہا عقل، زندگی کے صحیح اقدار کی مکمل رہنمائی نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ خرد، نیک و بد کے تصور سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتی۔ یہ عشق ہے جو انسان کو

خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز سکھاتا ہے اور بصارت کو بصیرت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

بیدل نقشبندی سلسلے کی نسبت سے مجدد الف ثانی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ بیدل کے کلام میں حرکت اور روحانیت ہے۔ ان کے کلام میں حرکی تصور حیات کی جھلک ملتی ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اقبال، بیدل سے متاثر ہوئے۔ اسی لیے اقبال نے بیدل کو مرشد کامل کہا ہے۔ بیدل کے ہاں تصور خودی بھی ملتا ہے۔ اقبال نے خودی کا تصور بیدل سے لیا۔ مگر بیدل کی خودی، خود شناسی سے عبارت ہے۔ جب کہ اقبال کی خودی کا دائرہ فرد اور قوموں کی تعمیرت وسیع ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کی خودی، سوال سے کمزور ہوتی ہے اور جماعت یا قوموں کی خودی دوسروں کی غلامی اور دست نگر ہونے سے ضعیف پڑتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال نے فلسفۂ خودی کو سیاسیات پر منطبق کرتے ہوئے پیش کیا ہے اور ان کے اس فلسفے کا اثر ہوا۔ یعنی یہ کہ اقبال کا فلسفۂ خودی چل نکلا۔ بیدل، سیاسیات اور معاشیات میں نہیں الجھے۔ اس لیے کہ ان کی خودی، خودشناسی تک محدود رہی۔

اقبال نے انسان کے ذوق غلامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ جذبۂ بندگی کا عالم یہ ہے کہ خود آدمی، آدمی کا غلام بن جاتا ہے جب کہ معمولی جانوروں تک میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ مثلاً کتا دوسرے کتے کا غلام نہیں ہوتا۔ نہ گدھا گدھے کے سامنے جھکتا ہے۔ مگر انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے دوسرے انسان کے سامنے سرِ نیاز خم کر دیتا ہے۔ یہ مضمون اقبال سے پہلے بیدل کے ہاں ملتا ہے:

بیدل بہ حصولِ رزق آمادہ بشر
سگ چاکر سگ نہ گشت، خر بندۂ خر
از مخترعات کار، گاہِ امکان مبر
این ننگ شعور نیست، جز صنع بشر

بیدل کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودی کے متعلق لکھتے وقت اقبال کی نظر بیدل کے کلام پر تھی۔ کیوں خودی کے مضامین اور خود شناسی کی تعلیم بیدل کے ہاں ملتی ہے۔ مگر اقبال کی خودی بیدل کی خودی سے مختلف ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ انسان خودی کے اعلیٰ مقام پر پہنچ نہیں سکتا۔ جب تک وہ پہلے شمشیر لا الہ سے تمام ماسوا کو فنا نہ کر دے۔ اقبال کے نزدیک زندگی استحقاق کا نام ہے۔ عجز و عاجزی کا نہیں۔ اسی طرح غالب کی خودی، ذاتی خودی تک محدود ہے۔ اقبال کی خودی، ذاتی خول سے نکل کر، آفاق کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اور وہ نہ صرف کائنات بلکہ پوری دنیائے انسانیت کو درسِ خودی دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں غالب کا شعر ہے:

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اقبال کی خودی ذوق یقین کی تلقین کرتی ہے۔ مردہ قوم میں سورِ اسرافیل پھونکتی ہے خودی فرد کے علاوہ قوموں کی شخصیت کی بھی تکمیل کرتی ہے۔ وہ زندگی کو غلامی سے نجات دلاتی ہے اور لوگوں کو درس عمل دیتی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجب نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

اس شعر میں خودی کی تلقین ہے اور نوجوانوں کو خودی پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ جو قوموں کی تعمیر میں حصہ لیتی ہے۔ جب کہ غالب کا مذکورہ شعر یعنی:

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ شعر محض غالب کی ذاتی انا اور انفرادی خودی کی عکاسی کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں خودی کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ چناں چہ اقبال نے کہا ہے:

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار، پر مغیاں و حریر

یہاں لفظ خودی کسی محدود معنی میں مستعمل نہیں ہوا۔ اقبال نے پس چہ باید کرد میں کہا ہے:

تو خودی اندر بدن تعمیر کن
مُشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن

یا یہ مصرعہ:

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

غرض بیدل اور غالب کے ہاں خودی کا جو تصور ہے وہ خود داری یا خود نگری کے معنی میں ہے۔ اقبال کے ہاں خودی کا تصور بہت وسیع ہے۔ ان کے ہاں خودی کا مفہوم، افلاک کی وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ اقبال کا تصور خودی مستقل ایک فلسفہ اور مربوط نظریہ کی شکل میں ہے۔ جس کا ایک مقصد ہے اور ایک پیغام ہے۔ اور وہ یہ کہ اقبال خودی کے ذریعے کھوئی ہوئی قوم کو جگانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ملتِ بیضا کے تن مردہ میں بیداری کی لہر دوڑ جائے اور مایوس و ناتواں قوم کو طاقت و توانائی ملے۔ اقبال کی شاعری ذہنوں کو بیدار کرتی ہے۔ اور قوموں کو ایک دوسرے کا دست نگر ہونے سے بچاتی ہے:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات

غالب نے بیدل، ظہوری، صائب، عرفی، نظیری کے مطالعے سے اپنے لیے ایک جہانِ تازہ پیدا کیا۔ اقبال نے بیدل، غالب، نیٹشے، برگساں، ہیگل، رومی اور شوپنہار کے مطالعے سے اپنے لیے الگ راہ استوار کی۔ اقبال کے ہاں مقصد آفرینی، برگساں کے تخلیقی ارتقا سے متاثر ہوئی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ برگساں کا نظریۂ ارتقا حیاتیاتی اور مادی ہے، روحانی نہیں۔ اقبال کے ہاں حیات و کائنات کے ساتھ روحانی احساس بھی ملتا ہے۔ وہ نیٹشے کی طرح قوم کو درسِ خودی دینا چاہتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مقصد آفرینی اور عملِ صالح سے فرد کی خودی مکمل ہوتی ہے۔

خودی تعمیر کن در پیکر خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شَو
(پیامِ مشرق)

یا

تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

غالب کا فلسفیانہ کلام، طرزِ بیدل کی ارتقائی شکل ہے۔ اقبال بیدل اور غالب دونوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ اقبال کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھوں نے مشرق و مغرب کی بہترین درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ مشرقی افکار سے مستفیض ہوئے اور مغربی فلسفہ دانوں کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ بیدل اور غالب کو مغربی ادبیات تک رسائی نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اپنی فارسی دانی اور زبردست دماغ کے مالک ہونے کے باوجود فلسفیانہ موشگافیوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ غالب نے مصیبتیں جھیلیں۔ زمانے کا اُلٹ پلٹ دیکھا۔ اس لیے انسانی خودداری کو سامنے رکھتے ہوئے خدا سے عرض کیا:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس شعر سے اقبال کے شکوہ میں جو ادب کا رنگ ملتا ہے اقبال نے کہا ہے:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اقبال نے اپنے پیرایۂ بیان کو صرف غزل تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے اظہارِ بیان کے لیے غزل کے علاوہ مسدس، قطعہ اور طویل نظموں کو اختیار کیا۔ اس سے بھی بیدل اور غالب کے مقابلے میں ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہوتا نظر آتا ہے۔

یہ بات کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ غالب اور اقبال، بیدل کی فکر کی پیداوار ہیں۔ بیدل کے کلام میں جو رفعتِ تخیل اور

حکیمانہ تفکر ہے اس نے مشرق کے ان دو مفکرین کے دماغ کو متاثر کیا۔ بیدل کی شاعری میں خودی، بے خودی، امروز و فردا، دنیا و عقبیٰ اور بالخصوص ہستی کی گتھیاں سلجھانے کے مضامین ملتے ہیں۔ اقبال نے ان افکار سے استفادہ کیا اور پھر مغربی افکار و ادب کے مطالعے سے اپنی دنیائے شاعری کی عمارت تعمیر کی۔ یہ ایک ذہنی کیفیت تھی۔ جو اقبال کو بیدل اور غالب سے متاثر ہونے کے بعد، سخن گوئی کا بحر بے کراں اور محیط بے ساحل بننے کی طرف لے گیا۔ طور معرفت بیدل کی شاہکار مثنوی ہے۔ غالب نے بیدل کی پیروی تو مشکل پسند ہو گئے۔ مگر اقبال نے مشکل پسندی سے صرف نظر کر کے بیدل کی حرکی شاعری، خودی و بے خودی اور نظریۂ زمان و مکان اور مثنوی اسرار خودی و رموز بے خودی تصنیف کی۔

بیدل یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے قلندرانہ زندگی بسر کی۔ اہلِ علم و حکمت ان کے قدردان تھے۔ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے:

> بیدل عظیم آبادی مے کدۂ سخن کے پیر مغان تھے۔ ان کو شعرا میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو افلاطون کو حکمائے یونان میں ہے۔

شاید یہی ایک خوبی ہے جس نے غالب اور اقبال کو متاثر کیا۔ اور وہ بیدل سے اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ بیدل کے نزدیک کائنات ایک واحد دل کی طرح ہے یہی ان کا تصوف ہے اور یہی ان کا فلسفہ ہے کہ دفترِ دل کا ایک لفظ، صحیفۂ فطرتِ انسانی کی آیت ہے۔ انگریز فلسفی برکلے نے بھی یہی کہا ہے مگر اقبال فرانسیسی فلسفی برگساں کے نظریۂ ارتقائے حیات میں بیدل کے اسی تصور کا سراغ لگا سکے۔

اسی تصور پر اقبال کے نظریۂ زمان و مکان کی بنیاد ہے۔ جو دو صورتوں میں نمایاں ہے۔ ایک مادہ جس سے زمان و مکان کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ دوسرا قلب جس کا کام تصورات و خیالات ہیں۔ ہیگل کا نظریہ بھی واقعہ واحدہ ہے۔ وہ بھی کائنات کو ایک واقعہ واحدہ تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک وجود مطلق، قائم بالذات ہے۔ اور کائنات قائم بالحق ہے قائم بالذات نہیں۔ فرانس کا فلسفی ڈیکارٹ، دوئی کا قائل ہے۔ مگر بلجیم کے فلسفی لائبز نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ جرمن فلسفی کانٹ کے خیال میں بھی دو حقیقتیں ہیں۔ اوّل شکل وصورت اور وزن ہے۔ دوسرے رنگ میں ذائقہ وغیرہ ہے۔ اقبال نے اپنی تین نظمیں یعنی الوقت سیف، نوائے وقت اور حکیم آئن اسٹائن میں اپنے نظریۂ زمان و مکان کو بیان کیا ہے۔ آئن اسٹائن نے جب اپنا نظریۂ اضافیت پیش کیا تو بڑی دھوم مچی اور وہ یہ تھا کہ ہمارے گرد کی چیزیں تین پیمائش رکھتی ہیں یعنی طول، عرض، عمق، اصطلاح میں ان پیمائشوں کو ابعاد ثلاثہ کہتے ہیں۔ دنیا یعنی مکان انہی ابعاد ثلاثہ کا مُرکّب ہے۔ آئن اسٹائن نے چوتھا بُعد زمان کو کہا۔ مکان ہمیشہ فانی ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ کی صنعت لامکان ہوئی۔ اور زمانہ بھی خدا ہوا۔ پیرس میں جب علامہ اقبال کی ملاقات برگساں سے ہوئی تو دوران گفتگو اقبال نے زمانے کے بارے میں برگساں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی۔

لا تسبّو الدھر مان الدھر ھو اللہ۔

زمانہ کو برا نہ کہو کیوں کہ زمانہ ہی اللہ ہے۔

یہ سن کر برگساں اچھل پڑا۔ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بھی دہر، خدا کے اسمائے صفات میں سے ہے۔ اقبال کے نظریۂ زمان و مکان کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور کہا کہ ہر واقعہ کی تخلیق میں زمانہ کو دخل ہے۔ بغیر زمانے کی حرکت کے مکانی ابعاد میں خود بخود تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تخلیق کی تہہ میں دراصل کائنات کا ہاتھ ہے۔ کیوں کہ خودی زمان و مکان کی خالق ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل ایران نے امیر خسرو اور فیضی کی شاعری کو تو مانا مگر بیدل اور غالب کی فارسی شاعری کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ اقبال جو بیدل اور غالب سے فیض یاب ہوئے، آج ایران کا بچہ بچہ اقبال کے نام کو جانتا ہے۔ اور اہل ایران اقبال کو نہ صرف فارسی کا بلند پایہ شاعر تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کو عظیم مفکر فلسفی کا بھی درجہ دیتے ہیں۔

زمانہ سب سے بڑا نقاد ہے جو چیز وقت کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے قائم و دائم رہتی ہے ورنہ زمانے کے معیار سے گر جائے تو فنا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ہر معمولی چیز کا مقدر فنا ہے۔ وقت کے پتھروں کی تاب لانا اور زندہ رہنا کافی مشکل ہے۔ جو پتھروں کو سہہ جائے وہ بقا اور شہرتِ دوام حاصل کرتا ہے۔

اقبال اس میدان کے مرد نکلے اور حیات جاوید پا گئے۔ ایران کے ملک الشعرا بہار نے درست کہا ہے کہ جو کام سب اُدبا اور شعرا مل کر نہ کر سکے۔ اقبال نے تنہا اسے سرانجام دیا۔ اقبال ایسے مفکر فلسفی شاعر ہیں کہ نہ صرف عالم اسلام کو ان پر ناز ہے بلکہ وہ ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک بن گئے۔ اقبال نے مغرب میں براؤن، برگساں اور نکلسن سے براہ راست مذاکرات کیے اور کانٹ گوئٹے، نیٹشے، شوپنہار، ہیگل، ڈیکارٹ، ولیم جیمز، ملٹن، شیلے، ورڈز ورتھ اور کیٹس کا خوب مطالعہ کیا اور ان کی ہر اچھی بات سے استفادہ کیا۔ اسی طرح مشرق میں بیدل، غالب، رومی، معرّی، رازی، غزالی، شاہ ولی اللہ، مجدّد الف ثانی، محی الدین ابن عربی، صاحب کشّاف، بوعلی سینا اور قرآن حکیم کی لفظیات کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے اثرات قبول کیے۔

یہ ہیں فکر اقبال کے چند پہلو اور اقبال کی شاعری کا تاریخی پس منظر جس سے ان کی شاعری کا فلسفہ اور فکر کا تانا بانا بنا۔

ڈاکٹر شاہدہ یوسف

پیامِ مشرق کی نظم ''تسخیرِ فطرت'' کی ڈرامائی ہیئت

علاّمہ اقبال کی عظیم ڈرامائی نظم ''تسخیرِ فطرت'' کے پلاٹ یا کہانی کی واقعاتی اساس قصۂ آدم پر مبنی اُن آیات سے ماخوذ ہے جن کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ آدم کی آفرینش کے مراحل، اس کی فضیلتِ علم، اس کا مسجودِ ملائک ہونا اور نیابت کے شرف پر فائز ہونا، اس کی جبلّت میں ترغیب وتحریص کے عنصر کے تحت اس کا ابلیس کے دامِ فریب میں آنا اور بالآخر 'ہبوط' کے المیے سے دوچار ہو کر جنت سے باہر آ جانا اور پھر قیامت کے روز خدا کے حضور ایک زیرک و دانا وکیل کی طرح اپنا مقدمہ لڑنا اور تاویلاتِ گناہ پیش کرنا علاّمہ اقبال کی اس ڈرامائی نظم کو یونانی ڈراموں سے کہیں زیادہ دل فریب بنا دیتا ہے۔

ان کی نظم ''تسخیرِ فطرت'' پانچ ایکٹ کے عظیم الشان ڈرامے سے مشابہہ نظر آتی ہے۔ محفلِ کون و مکاں کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے اس عظیم الشان ڈرامے کی واقعاتی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

(۱) میلادِ آدم، (۲) انکارِ ابلیس، (۳) اغوائے آدم، (۴) آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید، (۵) صبحِ قیامت:

> ''علاّمہ اقبال کے نظامِ فکر کے کلیدی اجزا کیا ہیں؟ حق، بشر اور اُن کا رشتۂ باہمی۔ اِن ارکانِ ثلاثہ سے روزِ ازل ایک عظیم ڈرامے کی بنیاد رکھی گئی جس کی بساط ابد تک دراز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ڈرامے کی نوعیت تصوراتی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ انسان کا اس کائنات میں مقام، منصب اور اہمیت کیا ہے، ایک طرف عالمِ اکبر ہے تو دوسری طرف عالمِ اصغر اور انھیں ایک منصوبے کے تحت خاص کردار ادا کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔''(۱)

علاّمہ اقبال نے اس عظیم الشان نظم کے پانچ اجزا میں داستانِ آدم کی کڑیوں کو جوڑ کر اس کائناتی ڈرامے میں منطقی ارتقا (logical progression) دکھایا ہے۔ نظم کے پہلے حصّے ''میلادِ آدم'' میں آفرینشِ آدم کے اہم ترین واقعے سے محفلِ کون و مکاں میں ایک ہنگامہ خیزی، ہلچل، گرم جوشی اور ڈرامائی سنسنی (dramatic sensation) کا تاثر پیدا کرنے کے لیے علاّمہ اقبال نے الفاظ واصوات سے تحیر زا، متحرک اور توانا منظر تخلیق کیا ہے۔

اس منظر میں آسمان سے شبستانِ ازل تک ملائکہ کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ سربستہ رازوں کے پردے چاک کرنے والی ہستی کی آفرینش ہو چکی ہے۔ اس کی آفرینش کے اعلانِ عام سے کائنات پر لرزہ طاری ہے۔ فطرت پریشان ہے کہ جہانِ مجبور کی خاک سے ایک خودگر، خودشکن اور خودنگر ہستی معرضِ وجود میں آ چکی ہے۔ ظہورِ آدم کی تہلکہ خیزی سے بیدار ہوتی ہوئی آرزوئیں ایک جہانِ تازہ پیدا کر رہی ہیں۔ زندگی کی عمر بھر کی تڑپ نے آسمان کے پرانے گنبد میں ایک در کھول دیا ہے اور ان سارے کوائف کے بیان سے ایک مؤثر ڈرامائی منظر کی تشکیل ہو رہی ہے۔ نظم کے دوسرے حصے ''انکارِ ابلیس'' میں ابلیس کی توجیہات ڈرامائی عمل کو تیز کر دیتی ہیں۔ اس کی مہتم بالشان ہستی کے کرداری خصائص، اس کا تحرک، فتنہ سامانی، تخلیقی تپش، غرور و تکبر، سرکشی اور طغیانی، آن بان اور شرانگیزی کے پیرائے علامہ اقبال کی کردارگری اور کردار آفرینی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

من ز تنک مائگاں گدیہ نہ کردم سجود
قاہرِ بے دوزخم، داورِ بے محشرم

آدم خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو، پیر شود در برم(۲)

نظم کے تیسرے حصے ''اغوائے آدم'' میں ابلیس ایک زیرک اور تجربے کار دلن کی طرح ترغیب و تحریص کے حربے سے انسان کو دامِ فریب میں لاتا ہے اور فلسفیانہ حربوں سے اُسے جذباتی خلفشار میں مبتلا کرتا ہے اور اس طرح اسے آمادۂ بغاوت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ''اغوائے آدم'' میں ابلیس کی ترغیبات سے علامہ اقبال کی کردار نگاری کے جوہر مزید کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہیچ نیامد ز تو غیرِ سجودِ نیاز
خیز چوں سروِ بلند، اے بعمل نرم گام

کوثر و تسنیم بُرد از تو نشاطِ عمل
گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام

زشت و نکو زادۂ وہم خداوندِ تست
لذتِ کردار گیر، گام بنہ جوئے کام

خیز کہ بنمائمت مملکت تازۂ
چشمِ جہاں بیں کشا، بہرِ تماشا خرام(۳)

ابلیس کے ان مکالمات سے علامہ اقبال کی نفسیاتی ژرف نگاہی اور ڈرامائی تاثر کی تخلیق پر اُن کی فطری صلاحیت سامنے آتی ہے۔
نظم کے چوتھے حصے ''آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید'' میں علامہ اقبال نے آدم کی سادہ لوحی اور نئی آزادانہ فضاؤں میں اس

کے پُرشوق اور والہانہ جذبات کی بڑی بھرپور مصوّری کی ہے اور انھوں نے فطرتِ ابلیس ہی کی نہیں، فطرتِ آدم کی رمز شناسی کا بڑا دل نشیں ثبوت فراہم کیا ہے:

نظم کے آخری حصّے ''صبحِ قیامت (آدم در حضور باری)'' میں علاّمہ اقبال نے ایک سرد و گرم چشیدہ زیرک و چالاک آدم کی حیرت انگیز کردار گری سے اپنے قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور اس طرح ڈرامے کے اہم جزو، یعنی کردار آفرینی پر اپنی مکمّل فنّی گرفت کا ثبوت فراہم کیا ہے:

گرچہ فسونش مرا بُرد ز راہِ صواب
از غلطم درگذر عذرِ گناہم پذیر

رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جُز بہ کمندِ نیاز ناز نہ گردد اسیر

تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز
بستنِ زنّارِ اُو بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را(۴)

حواشی:

(۱) رفیق خاور، ''اقبال کا فارسی کلام، ایک مطالعہ،'' لاہور بزم اقبال، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۷
(۲) محمد اقبال، ''پیامِ مشرق،'' لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء، ص ۸۶
(۳) ایضاً، ص ۸۶
(۴) ایضاً، ص ۸۸

روحی طیبی ☆

شاعرِ مشرق علاّمہ محمد اقبال

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ
(اقبال)

تمہید:

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغام بر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور توقیر آدم کا مبلغ بھی۔ وہ فکر و ذکر سے اور خبر و نظر کا آئینہ گر ہے، صاحب عرفان و وجدان ہے، افکار و تاثرات کا تجزیہ نگار ہے، وہ ایک بے قرار رُوح ہے جس میں پیغمبروں کا سا دل اور فلسفی کا دماغ ہے، قلندرانہ مزاج اور شاعرانہ تخیل ہے ''اقبال'' یہ نام نہ صرف ہماری شاعری کی آبرو ہے بلکہ ہماری قوم کے لیے اقبال مند بھی ہے، اقبال ہمہ جہت شخصیت اور ہمہ گیر دل و دماغ کا مالک ہے۔ کسی بڑی شاعر کے کلام میں سے ایک مربوط نظریہ حیات و کائنات کو اخذ کرنا ایک دشوار کام ہے، ہر موضوع کے متعلق اقبال کے اشعار بکثرت ہیں، اگر تنقید کے دھاگے میں تشریح کے موتیوں کو پرو دیا جائے تو دھاگہ بے قیمت اور بے حیثیت ہے لیکن ایک بڑی خدمت انجام دیتا ہے۔ دشواریوں کے باوجود اقبال کے افکار کو ایک ربط میں لانا ضروری معلوم دیتا ہے تاکہ مجموعی حیثیت سے اقبال کا نظریۂ حیات واضح ہو سکے۔ خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں...

''قرآن کریم نے سورۃ شعرا میں شاعر کی حیثیت اور اس کے اندازِ حیات کا مختصر مگر جامع الفاظ میں تجزیہ کیا ہے اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ نبی کریم کو مخالفین کبھی مجنوں کہتے اور کبھی شاعر قرار دیتے تھے(۱) قرآن میں اچھی شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں تشبیہ و تمثیل و استعارہ، مسجّع اور مقفیٰ سورتیں دل نشیں اندازِ کلام سبھی کچھ اس صحیفے میں بدرجہ کمال موجود ہیں، اسرار حیات سے ناآشنا لوگوں کو یہ کلام خداوندی ایک شاعر کا کلام دکھائی دیا۔ ارشادِ ربانی ہے ''آؤ تمھیں بتائیں کہ شاعر

☆ لکچرار شعبۂ اردو، ڈی اے ڈگری کالج برائے خواتین، فیز III

علی العموم کیا ہوتے ہیں اور انبیاؑ سے ان کو کس طرح ممتاز کر سکتے ہیں۔''(۲)

اقبال نے شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی نظیر مسلمانوں کی شاعری کی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی، اقبال کے کلام میں جو ثروتِ افکار ہے وہ عدیم المثال ہے، علاّمہ اقبال فلسفی بھی ہیں شاعر بھی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام فلسفی سے بلند تر ہے:

دیکھ اے چشم عدو، مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پر خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں

علاّمہ نے ایک جگہ اپنی ڈائری میں فلسفہ و شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''فلسفہ انسانی عقل کی خنک تیرگی میں ٹھٹھرتے ہوئے تجربات کا مجموعہ ہوتا ہے، شاعر آتا ہے اور اپنے سوزِ دل سے انھیں گرما کر واقعیت میں بدل دیتا ہے۔''(۳)

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے۔ زبانِ اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ ''اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو دان دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران اور جرمن و انگلستان تک پہنچ گئی ہے۔''(۴)

اقبال کی شاعری صرف ان معنوں میں فلسفیانہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مدلّل تصور پیش کرتی ہے دنیا کے چند گنے چنے شاعروں ہی سے یہ بات ممکن ہو سکی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کسی پیغام یا نظامِ حیات کو اس طرح جذب کر لیں کہ وہ فلسفے کا جزو نہ رہے شاعری بن جائے اقبال نے یہی کیا یعنی فکر کو شعر میں ڈھال دیا۔ اسی وصفِ خاص کے سبب ان کی شاعری کو حکیمانہ اور خود انھیں مفکر شاعر کہا جاتا ہے، اقبال کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ انھوں نے لطافتِ شعری کو مجروح کیے بغیر حکیمانہ لب و لہجہ عطا کیا، پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں، ''اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔'' انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا یقین کارفرما ہے ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں تک حکیم اور کہاں تک شاعر ہیں بلکہ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں۔(۵)

اس نقطۂ نظر سے اقبال بیسویں صدی کا ایک ایسا عظیم مفکر شاعر ہے جس نے جدید فلسفے کے گہرے مطالعے، انسانی غم خواری کے شدید جذبے اور غیر معمولی فنی بصیرت کی مدد سے مشرق و مغرب کو یکساں متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے اقبال اور اقبالیات کے مطالعے کی مقبولیت، اہمیت و افادیت بھی بڑھتی جا رہی ہے اقبال اپنے دور میں مستقبل کی آواز تھا ''فکر اسلامی کا مفسّر اور اتحادِ ملکِ اسلامیہ کا داعی تھا۔''(۶)

تاریخِ عالم ہزاروں ایسے جانبازوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جس کا تصوّر قدم قدم پر دعوتِ فکر و عمل پیش کرتا ہے مگر ایسے ناخدائے قوم و ملت بہت کم دیکھے گئے ہیں جنھوں نے ڈوبتی کشتی کی ناخدائی کی ہو اور ایک پوری قوم کے بھٹکے ہوئے کارواں کو منزلِ مقصود تک پہنچایا ہو۔(۷) شاعرِ مشرق حکیم الامت علاّمہ محمد اقبال کا شمار ایسی ہی تاریخ ساز اور عہد آفریں ہستیوں میں ہوتا ہے،

اقبال کی شخصیت ایک صناع اور ایک فنکار سے بہت بلند ہے ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ، عہد حاضر کے ذہنی و سماجی حالات، خودی، عشق، عمل، پیغام اور نصیحت سبھی کچھ ہے ان کی شاعری فکر و فلسفے سے گزر کر الہامی شان پیدا کر دیتی ہے۔

پس منظر:

انیسویں صدی کی آخری دہائیاں برصغیر کے مسلمانوں کے حق میں بڑی مردم خیز اور حوصلہ افزا تھیں مردم خیز اس لحاظ سے کہ ان میں مولانا حسرت موہانی اور قائداعظم سے لے کر علامہ سید سلیمان ندوی و علامہ شبیر احمد عثمانی تک متعدد ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جو آگے چل کر بلند مرتبہ شاعر ادیب اور عالمِ دین اور رہنمائے قوم ثابت ہوئیں، حوصلہ افزا اس اعتبار سے کہ اس وقت تک سرسید احمد خان، نواب محسن الملک، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، اور اکبر الہٰ آبادی کا سایہ قائم ہو چکا تھا یہ صدی ہر لحاظ سے مسلمانوں کے لیے پُر آشوب تھی۔ یہ دور اگرچہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی حد درجہ تکلیف دہ صورت حال ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد اور برصغیر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد نمودار ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی یہ مسلم کش حکمت عملی اور بھی سخت گیر ہو گئی، ''ہنٹر نے لکھا ہے، مسلمانانِ ہندوستان اب اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان حالات نے جہاں عام مسلمانوں کو مایوس اور نڈھال کیا وہاں خاص خاص لوگوں کو سوچنے اور کچھ کرنے پر بھی آمادہ کیا، سرسید احمد خان ۱۸۶۷ء میں کہہ چکے تھے کہ ہندو مسلمان اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' ۱۸۷۰ء میں سرسید نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اسی کے ذریعے اردو زبان کی سنجیدہ علمی و ادبی مضامین کا متحمل بنانے کی کوشش کی ۱۸۷۵ء میں ایک ایسے مدرسے کی بنا ڈالی جو کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور تحریک آزادی سے موسوم ہوا۔

جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اردو نثر میں تہذیب الاخلاق کے ذریعے نئی تبدیلیوں کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا ۱۸۷۴ء سے پنجاب میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی کوششوں سے مشاعروں کی فضا بدل گئی اردو شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا مناظرِ فطرت اور اخلاقی و اصلاحی موضوعات پر نظم کہنے کا رواج ہوا۔ مولانا حالی نے شاعری اور نثر دونوں کی کایا پلٹ دی، ان کے مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس نے شاعروں ادیبوں اور ملّی رہنماؤں سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، بنگال سے پنجاب تک روشنی کے آثار ظاہر ہونے لگے بلکہ یوں کہیے کہ حالی کی مناجات:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

قبولیت کی منزل کو پہنچ گئی۔ اور مسلمان انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یکا یک چونک پڑے، فکر و فن کی دنیا وہی پرانی تھی قبول عام شعرا داغ اور امیر مینائی تھے جدید و قدیم تصورات کی اس فضا میں علامہ اقبال نے آنکھ کھولی پروان چڑھے اور آخر وہ وقت آ گیا جب اقبال مسلمانوں کے لیے اور شعر و ادب کے حق میں سرسید احمد خان کے خوابوں کی تعبیر بن گئے:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

تعارف:

اپنی پیدائش کے سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں، ''میری ولادت (۹ نومبر ۱۸۷۶ء) سے چند روز قبل میرے والد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا عجیب وغریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے، اس ہجوم میں، میں بھی ہوں، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آ گرا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ انھوں نے اس خواب کی یہ تاویل نکالی کہ وہ با اقبال پرندہ میں ہی تھا۔'' (۸)

اقبال کی ابتدائی تعلیم وتربیت مشرقی انداز میں خالص اسلامی بنیادوں پر ہوئی اللہ اور رسول پاک ؐ کی محبت کا جذبہ اپنے والد محترم سے ملا اور مشرقی علوم وادب سے ان کی عالمانہ واقفیت اور وابستگی ان کے استاد سید میر حسن کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بعد میں کالج کی تعلیم کے دوران فلسفہ کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے ترقی پذیر ذہن کو بہت متاثر کیا۔ شاعری میں انھوں نے مرزا داغ دہلوی کو اپنا استاد بنایا اور ابتدائی دور کی غزلیں اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجیں لیکن کچھ عرصے بعد اپنی شاعری کا رُخ خود ہی متعین کر لیا۔ انھوں نے فلسفہ اور شاعری کے بہترین ذہنوں سے فیض حاصل کیا اور آخرکار مولانا رومی کو اپنا رہنما بنا لیا جن کے افکار میں اقبال کو اسلامی تصوف کی متحرک لہریں اور زندہ قدریں نظر آئیں، اقبال زندگی کے قائل تھے وہ ذکر وفکر اور جذب وسرور کے ذریعے زندگی اور وجودِ ذات کا عرفان حاصل کرنا چاہتے تھے وہ آہِ سحرگاہی اور نالہ نیم شبی کو اس بے قرار روح کی پکار سمجھتے تھے جو شہیدِ آرزو ہے اور ستارے سے آفتاب کی طرف بڑھنا چاہتی ہے، اقبال کے نزدیک زندگی حرکت وعمل اور ذوقِ جستجو کے سبب رواں دواں ہے ان ہی زندہ افکار نے انھیں رومی کے دامن سے وابستہ کر دیا۔

''لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ اقبال نے ابتدا میں چند غزلیں ارشد گورگانوی۔(۹) کو دکھائیں، لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان پر جو مشاعرہ ہوا اس میں اقبال نے اپنی پہلی غزل سنائی تھی جس پر ارشد گورگانوی نے ان کے اس شعر کو سن کر بے حد داد دی۔(۱۰)

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اقبال کی باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز ۱۸۹۳ء سے ہوتا ہے جو ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس دور میں وہ داغ کے رنگ میں غزلیں کہتے ہیں مثلاً:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

ان چند غزلیات میں جو بانگِ درا میں درج ہیں ارتقائے فن کی رفتار خاصی تیز معلوم ہوتی ہے بعض غزلوں میں فکر کی گہرائی اور فن کی پختگی نمایاں ہے اس سے پہلے دور کی غزلیات میں کچھ عشقِ مجازی کی آمیزش ہے کچھ روایتی مضامین لیکن ان کے ساتھ ساتھ ملے جلے حکیمانہ اشعار بھی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر روایتی تغزل سے رفتہ رفتہ الگ ہو رہا ہے۔

داغ سے رومی تک پہنچنے میں اقبال نے جو ذہنی سفر طے کیا ہے اس میں انھیں علم و عرفان کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا، اس راہ میں قدم قدم پر انھیں فلسفیوں نے متاثر کیا کیوں کہ فلسفہ تو اقبال کا خاص مضمون تھا۔ تصوف کا مطالعہ انھوں نے بڑی دل جمعی اور دلسوزی سے کیا تھا، وہ عقل و عشق کے سارے اسرار و رموز سے واقف تھے لیکن عقل پر انھوں نے عشق کو ترجیح دی اور بتایا کہ آتشِ نمرود میں بے خطر کود جانے کا حوصلہ صرف عشق ہی عطا کرتا ہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ اس جرأتِ رندانہ کے بغیر زندگی کا کوئی مرحلہ طے نہیں ہو سکتا، عقل کی حدود بہر حال متعین ہیں جب کہ عشق لامحدود ہے، اقبال کے نزدیک زندگی کا مقصد، مقصد کی جستجو میں سرگرمِ سفر رہنا ہے:

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب
عقل سا تھ نہ دے سکی تو جذبہ شوق نے سہارا دیا
مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھو گیا وہ فرزانہ

اقبال نے عشق، یقین، علم، عقل، نظر، خبر، وجدان، دانشِ نورانی، جنون اور شوق کے الفاظ کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خاص اصطلاحی مفہوم عطا کرتے ہوئے جگہ جگہ ان کی تشریح کی ہے۔(۱۱)

صدقِ خلیل بھی عشق، صبرِ حُسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال کی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوا یہ وہ زمانہ ہے جو انھوں نے یورپ میں بسر کیا، وہاں کے قیام کے دوران لکھی گئی نظموں کی تعداد بہت تھوڑی ہے مگر ان میں ایک خاص رنگ وہاں کے مشاہدات کا نظر آتا ہے اس زمانے میں دو بڑے تغیرات ان کے خیالات میں آتے ہیں۔ ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جب میرا قیام بھی وہیں تھا۔(۱۲)

پہلا تغیر یہ تھا کہ شعر کہنا ترک کر دیں لیکن آرنلڈ صاحب نے رائے دی کہ شاعری کو چھوڑنا صحیح نہیں، دوسرا چھوٹا سا تغیر یہ آیا کہ اردو زبان کی جگہ اقبال نے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا لیا۔(۱۳) طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا اور یوں اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر آخر تک جاری رہا۔ اردو نظمیں بھی بہت سی کہیں جو شاہکار ہیں، فارسی میں اقبال کے قلم سے تین کتابیں نکلی،

''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی'' اور ''پیامِ مشرق'' ایک سے ایک بہتر، پہلی کتاب سے دوسری میں زبان سادہ اور عام فہم ہوگئی اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔ فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کی دورِ سوم کی نظموں پر پڑا اور ان میں اکثر فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں زیادہ ہیں۔

۱۹۱۰ء میں اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ ''بانگِ درا'' کے نام سے شائع ہوا۔ حصہ اوّل میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں اور حصۂ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی نظمیں ہیں اور حصۂ سوم میں ۱۹۰۸ء سے آخر تک کا اردو کلام ہے، اس مجموعے کی بعض نظموں اور غزلوں کے اشعار اور مصرعے ایسے ہیں جن پر باقاعدہ ایک مضمون لکھا جاسکتا ہے۔

اقبال شاعری کو اپنے افکار و خیالات پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے تھے انھوں نے کئی بار کہا ''فنِ شاعری سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہاں بعض مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کرنے کے لیے میں ملکی روایات کے مطابق نظم کا طریقہ اختیار کیا۔''

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

اقبال کے نزدیک یہ رجحان تکلیف دہ تھا کہ لوگ شاعر کے پیغام اور خیالات کو سمجھنے کے بجائے حسنِ شعر پہ جان دیتے ہیں۔ اقبال صرف شاعر ہی نہیں قوم کے رہبر بھی ہیں، وہ شاعری کو قیادت کا مرتبہ عطا کرنا چاہتے تھے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوں گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اقبال کی غزل کا ذہنی ارتقا ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۵ء تک اقبال کی روایتی غزل کا دور ہے اس دور میں وہ داغ اور غالب کے اتباع میں غزلیں کہتے ہیں غرض انھوں نے بیدل سے بھی استفادہ کیا لیکن تقلید کسی کی نہیں کی ان کا الگ اپنا رنگ ہے اور انفرادی لب و لہجہ ہے وحدانیت کے موضوع پر اقبال کی انفرادیت واضح نظر آتی ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں (۱۴)

عشق کی طرح غزل کی بھی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ ایک بار کسی کے مزاج میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتی، غزل سے وابستہ رہنے کے بعد شاعر فلسفہ و حکمت بیان کرے یا قومی و سیاسی رنگ شاعری اختیار کرے غزل کی دبی ہوئی چنگاری جذبات کو آنچ

فراہم کرتی رہتی ہے اور دلوں کو گرم رکھتی ہے۔ حالی، شبلی، جوش اور فیض سب کے ساتھ یہی ہوا ہے، اقبال کا دل عشق کی گرمی سے گداز تھا اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کرنے کے بعد انھوں نے نظم کی وسیع وادیوں میں سفر کیا لیکن غزل کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ اپنے لب و لہجے سے اس قطرے کو دریا بنا دیا۔

ابتدائی غزلوں سے قطع نظر اقبال نے اردو غزل کو افکار و خیالات کی دولت سے مالا مال کیا انھوں نے ادائے دلبری سے تقدیر اُمم تک کے مضامین باندھے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

(بالِ جبرئیل)

خاص طور پر بالِ جبرئیل کی غزلیں اردو کے شعری ادب میں نہایت قیمتی اضافہ ہیں، ان غزلوں کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو دیکھ کر غزل کے معترضین کی یہ بات بلکہ دلیل بڑی کھوکھلی معلوم ہوتی ہے کہ غزل زندگی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی، اقبال نے فنی پابندیوں میں رہ کر بلند اور دقیق خیالات نظم کیے کہ جن کی مثال نہیں ملتی۔

اقبال نے غزل کا دائرہ وسیع کیا اس کا رنگ و آہنگ بھی بدلا، ان کی غزلوں میں زندگی، فکر کی گہرائی اور جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے۔ اقبال نے غزل کو وسعت دے کر اپنے افکار کا ترجمان بنایا، غزل کی آبرو بڑھانے میں اقبال کی غزل کا ایک رنگ یہ بھی ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ کبھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اقبال کی نظم زندگی بخش ہے تو غزل روح پرور، انھوں نے اردو شاعری کی جو دولت عطا کی وہ خاص ان ہی کی دین ہے، وہ دولتِ اقبال ہے، ان کی شاعری نے ان رفعتوں کو چھو لیا جہاں شاعری پیغمبری کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل بن جائے

بالِ جبرئیل میں ایک جگہ خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مری خاک سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

تری بندی پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

دراصل اقبال کی غزل فکری غزل ہے۔ اقبال نے غزل کو فکری شعور اور حکیمانہ بصیرت سے ہمکنار کیا۔ اقبال نے غزل کو فلسفیانہ زبان میں بولنا سکھایا اقبال مشرق و مغرب دونوں جگہ کے فلسفے سے واقف تھے انھوں نے اردو غزل کو فکری عظمت دی غالب کی شعریت فلسفے پر غالب رہی لیکن اقبال کی فلسفیت شعر پر غالب آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزل میں خونِ جگر کی نمود کے ساتھ فلسفے کو اس کا موضوع بنایا اقبال نے غزل کی ذہنی دنیا بدل دی اور اس میں علمیت پیدا کی۔

اقبال نے اردو غزل کو رومی کا لب و لہجہ اور حافظ کا اسلوب دیا فارابی اور ابنِ سینا کی عقلیت دی اقبال نے غزل میں قومی، ملی، مذہبی، سیاسی اور اصلاحی موضوعات کو خوبصورتی سے برتا۔(۱۵)

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
(بالِ جبرئیل)

اقبال کی غزل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی غزلوں میں ردیف کا استعمال نہیں کیا، اقبال کی غزل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں تخلص کا استعمال نہیں کیا، حالی نے غزل کی اصلاح کے کام کو شروع کیا مگر اقبال نے ان کے مشن کو پورا کیا جدتِ ادا کے گراں قدر اضافے کے وسیلے سے اقبال نے اردو غزل گوئی کا ایک نیا باب کھول دیا۔ غزل کے حسن میں اضافہ کرنے میں اقبال کا زبردست حصہ ہے، اقبال کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بحریں ایسی انتخاب کیں جو حرکت کی طرف لے جاتی ہیں اقبال کی غزلوں کی بحریں حرکی ہیں اور تغیر و انقلاب کی ترجمانی کرتی ہیں۔ بالِ جبرئیل کی غزلوں میں شاعری کی فکر بلند سے بلند تر نظر آتی ہے۔ اقبال کی یہ غزلیں شعوری پختگی کو پہنچ گئی ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی غزل الہامی غزل ہے:

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہہ محبت وہ نگہ کا تازیانہ
(بالِ جبرئیل)

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی
(بالِ جبرئیل)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے بے آہِ سحر گاہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(بالِ جبرئیل)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

(بالِ جبرئیل)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

فطرت کو خیر کے روبرو کر، تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے، کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی رفعتوں سے کوئی چیز ہے جو شاعر کے دل و دماغ پر نازل ہو رہی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے علمی خزانوں سے موتی رولے ہیں بالِ جبرئیل کی غزلیں بلند ہمتی بے خوفی دلیری اور حوصلہ سکھاتی ہیں، اردو غزل کی ترقی و توسیع میں اقبال نے ویسا ہی اجتہادی کارنامہ انجام دیا جیسا خواجہ حافظ نے اپنے زمانے میں انجام دیا(۱۶) کیوں کہ جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے اقبال کی غزل انقلابی ہے اقبال کی غزل نے نیا آئین نیا دستور مرتب کیا بلکہ اسے قابلِ قبول بھی بنایا۔ اقبال کی غزل میں عشق ایک قوت کا نام ہے اقبال کے نزدیک عشق محبت یا وہم نہیں بلکہ اس کے پاس لذتِ شوق ہے کچھ پانے کی جستجو ہے۔ اقبال عقل کے مخالف نہیں لیکن صرف عقل کو رہبر نہیں بناتے بلکہ عشق کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، اقبال کے نزدیک عشق یقین ہے کائنات کی روح ہے، زندگی کا راز ہے عشق فقر بھی ہے سلطانی بھی عشق حرکت بھی ہے اضطراب بھی اقبال کہتے ہیں(۱۷) عشق پھول میں خوشبو، غنچہ میں چٹک، ستاروں میں نور، آب شاروں میں ترنم، کوئل کی کوک اور سبزہ زاروں میں طراوت ہے۔(۱۸)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

تصورات:

اقبال کے یہاں تصورِ حیات و کائنات اتفاقی نہیں بلکہ تقدیرِ الٰہی ہے، کائنات متحرک ہے، کائنات شئے نہیں بلکہ عمل ہے اور یہ عمل عبث نہیں بلکہ بامقصد ہے۔(۱۹) اقبال کی روحانی تعبیرِ کائنات و حیات شخصی خدا کے عقیدے پر مبنی ہے یہ عقدہ دینِ ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ ہے اقبال کے تصورات کا سب سے بڑا ماخذ قرآنِ حکیم ہے انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا قرآنِ حکیم کی آیات کی تفاسیر کو شامل کیا ہے، اقبال فرمایا کرتے تھے وقت کا تصور شخصیت کے بغیر نہیں ہو سکتا، ہندوستان ''صداقت'' کا متلاشی تھا، ایران ''جمال'' کا اور عرب ''اچھائی'' کا اسلام نے ان تینوں کو شخصیت میں جمع کر دیا۔ اقبال کے نزدیک ''فطرت'' ذاتِ خداوندی کے لیے اس طرح ہے جس طرح کریکٹر انسان کے لیے ہے۔(۲۰) اقبال تسخیرِ فطرت کے زبردست مبلغ ہیں لیکن وہ اس کو انسان کا اعلیٰ نصب العین قرار نہیں دیتے۔ انسان کا اعلیٰ نصب العین روحانی نوعیت کا ہے اور مذہب ہی اعلیٰ نصب العین کا شعور بخش سکتا ہے۔ اقبال خودی کا شاہدِ اوّل انسان کی اپنی ذات کو قرار دیتے ہیں، اقبال کا بنیادی تصور عظمتِ آدم ہے وہ انسان دوستی کے نظریے کو روحانی بنیاد فراہم کرتے ہیں کہتے ہیں:

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(طلوعِ اسلام: بالِ جبرئیل)

اقبال کہتے ہیں انسان کو جستجو کی خو عطا کی گئی ہے اس کے علم اس کی آرزوؤں اور اس کے عشق کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی

اقبال انسان کی عظمت، اس کی قوت، اور اس کے اختیارات کو اتنے فصیح و بلیغ انداز میں بیان کرتے ہیں جو عدیم المثال ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

(بالِ جبرئیل)

اہمیت و افادیت:

اقبال ایک انقلابی شاعر ہے، ملتِ اسلامیہ نے اقبال کے لیے کئی القاب و خطابات تجویز کیے کوئی انھیں حکیم الامت کہتا ہے کوئی

ترجمانِ حقیقت، کوئی انھیں شاعرِ اسلام کہتا ہے، وہ پیامبر خودی بھی ہیں اور مبلغِ ارتقا بھی وہ عشق کے رمز شناس بھی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر جو خصوصیت ان کے کلام پر حاوی ہوتی ہے وہ ہے تمنائے انقلاب۔ (۲۱) اقبال کی اہمیت بہ حیثیت شاعر اور ان کے کلام کی افادیت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک انقلابی شاعر ہیں۔(۲۲) اقبال وہ شاعر ہیں جن کا کلام مسلمانانِ برصغیر کی زندگیوں میں انقلاب لے آیا ہر وہ شاعر بڑا کہلاتا ہے جس کا کلام انقلابی ہو مگر اقبال سب سے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف شعر و ادب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا بلکہ ایک عام انسان کی زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ اقبال نے ماضی کا بغور مطالعہ کیا اور اُسے مستقبل کی نئی سمت سے آشنا کیا۔ اقبال جس دور میں پیدا ہوئے معلوم ہوتا تھا ملت کی کشتی اب کبھی کنارے پر نہ پہنچ سکے گی، سرسید احمد خان نے اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا حالی نے مسدس کے ذریعے ملت اسلامیہ کے خون کو گرما دیا اور ماضی کا شعور بیدار کیا اس پس منظر میں اقبال کی صدا بلند ہوئی۔ اقبال کے کلام کی افادیت کا اندازہ کرنا ہو تو ایک ایک شعر اس کی گواہی دے گا اقبال نے نہ صرف اپنے دور کے جذبات و احساسات کو شاعری میں سمویا بلکہ اس دور کے رجحانات و میلانات کو بھی سمیٹ لیا۔ اقبال نے اپنی شاعری سے بیک وقت دو کام لیے ایک یہ کہ اپنے معاشرے کے انسان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب، اپنے عقائد اور اقدار کا شعور دیا بلکہ اس پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی جدوجہد سے عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کی فکری شاعری جذبہ بن کر ہماری رگوں میں دوڑتی ہے اور اس سے پیدا ہونے والی حرارت انسان کو حرکت و عمل کی طرف لے جاتی ہے الغرض اقبال نے اپنی شاعری سے ایک طرف انسانی شعور کو اُبھارا اسے راستہ دکھایا اُس کی منزل کا تعین کیا پھر اسے نغمہ بنا کر ایک زندہ جذبے میں تبدیل کر دیا اور اسی جذبے نے معاشرے کو عمل کا راستہ دکھایا۔ اقبال کی شاعری قوتِ عمل کا پیغام بن کر انسان کو باشعور بنا گئی یہی اقبال کے کلام کی افادیت ہے کہ انسان قوتِ عمل کا پیکر بن گیا اس لیے اقبال کی شاعری نغمہ بھی ہے زندگی کا، اور فلسفہ بھی ہے فکر و عمل کا، اقبال کہتے ہیں:

نہ تو زمین کے لیے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے
(بالِ جبریل)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا نذرِ عقیدت:

دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز
اس صفحے سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز
جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدے پہ تیرا نام ہے باقی

حواشی:

(۱) فکر اقبال، تالیف: خلیفہ عبدالحکیم، ص ۱۲

(۲) ایضاً

(۳) شذراتِ فکرِ اقبال، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ص ۱۴۹

(۴) دیباچہ ''بانگِ درا'' از شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء سابق مدیر 'مخزن'

(۵) گنج ہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، ص ۱۸۲

(۶) اقبال سب کے لیے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۵

(۷) میزانِ تنقید، نسیم انوار ہاشمی، ص ۱۵۰

(۸) اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، ادریس صدیقی، ص ۵۷۳

(۹) لالہ سری رام، خمخانۂ اقبال، جلد اول، ص ۳۷، دہلی ۱۹۰۸ء

(۱۰) بانگِ درا، ص ۹۸۔۹۹

(۱۱) اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، ادریس صدیقی، ص ۵۷۲

(۱۲) مجموعہ بانگِ درا، مقدمہ/ دیباچہ شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء، مدیر 'مخزن'، ص ۱۵

(۱۳) ایضاً، ص ۱۵۔۱۶

(۱۴) بانگِ درا، اقبال، ص ۲۸۰۔۲۸۱

(۱۵) تاریخ جدید اردو غزل، ڈاکٹر وقار احمد رضوی، ص ۵۱۵

(۱۶) تاریخ جدید اردو غزل، ڈاکٹر وقار احمد رضوی، ص ۵۴۳

(۱۷) ایضاً، ص ۵۴۴

(۱۸) بالِ جبریل، ص ۵۱

(۱۹) اقبال اور انسان دوستی: طالب حسین سیال، ص ۲۱۳

(۲۰) ایضاً، ص ۲۱۴

(۲۱) فکر اقبال: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ص ۱۶۷

(۲۲) معاصرِ ادب: ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۹۵

سید شیراز علی زیدی☆

مغرب کے سیاسی نظام اقبال کی نظر میں

نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی مفکرین نے دُنیا کی ہر چیز کو مادیت کی نظروں سے پرکھنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجتاً ارتقاء کے مادی نظریے کی بدولت انسانیت کے عالمگیر اصولوں کی جگہ استحصال کو فروغ حاصل ہوا۔ یہودیت اور عیسائیت میں بین الاقوامی سیاسی مساوات کا نظام پہلے بھی موجود نہیں تھا مگر سیاست اور مذہب میں جُدائی کے تصور نے ریاست کو اخلاقیات سے بالکل ہی محروم کر دیا۔ حکمرانوں نے اس سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے کلیسا کو خریدا اور مغربی معاشرے کو تباہی کے اُس دہانے پر لا کھڑا کیا جس سے مغرب آج تک نجات حاصل نہیں کر سکا۔ جس معاشرے میں مذہبی رہنما اپنا ضمیر چند ٹکوں کے عوض بیچ کر حکمرانوں کی عیاشی میں ساجھے دار بن جاتے ہیں اُس معاشرے کی اخلاقی موت پر فاتحہ پڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ ایک زمانے میں مغرب میں پادری اور پوپ مالیے میں باقاعدہ حصے دار بن گئے تھے۔ روپے پیسے کی فراوانی نے اُنھیں اس قدر عیاش بنا دیا تھا کہ مقدس مقامات بھی بدکاری کے اڈوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ پادری اور پوپ حکمرانوں کی ڈگڈگی پر ناچتے اور عوام کے استحصال کو منشائے الٰہی سے تعبیر کرتے تھے۔

کلیسا کے پروردہ استحصالی نظامِ سیاست کے خلاف بغاوت کرنے والا پہلا شخص مارٹن لوتھر تھا۔ آخر عوام کی قوتِ برداشت کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ کلیسا کا فسوں ٹوٹا اور عیسائیت کے ٹکڑے ہوئے تو اہلِ مغرب کو اکٹھے ہونے کے لیے کوئی مرکزیت نہ مل سکی۔ بادشاہوں کے خلاف جاگیرداروں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بغاوت کی، جاگیرداروں کو صنعت کاروں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا جو بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کے سب طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ بورژوا بغاوت، پرولتاری بغاوت، غرض کہ مغرب میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، سماجی بغاوت سیاسی بغاوت، مذہبی بغاوت، معاشی بغاوت ہر طرف بغاوت ہی بغاوت تھی۔ مغربی دانشوروں نے اس صورتِ حال میں جو سب سے بڑا تیر مارا وہ وطن قومیت کے نام پر افراد کو جمع کرنے کا تھا۔ وطنی قومیت کا تصور اسلامی قومیت کے برعکس افراد کو زمینی حدود میں قید کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ایک ملک میں رہنے والے افراد بلاتفریق ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اس میں کسی اخلاقی نظام یا مذہب کی گنجائش نہیں رہ جاتی بلکہ افرادِ قوم جغرافیائی حدود کی بنا پر یکجا ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام نے اس کے برعکس قوم کا ایک ایسا تصور دیا ہے جس کی رو سے وہ تمام افراد جو کلمہ طیبہ پڑھ لیں خواہ اُن کا تعلق کسی نسل،

☆ریسرچ آفیسر۔ شعبۂ اقبالیات، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

رنگ، مُلک، یا قوم سے ہو، اسلامی قومیت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اپنی قومیت کی بنیاد روحانیت پر قائم کی ہے اور اپنی قومیت کو عالمگیر کر دیا ہے، جب کہ مادیت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے اہل مغرب نے اپنی قومیت کی بنیادیں زمینی حدود پر استوار کیں مگر اُن کی یہ کوشش بھی اُنھیں سیاسی و سماجی تباہی سے نہ بچا سکی۔ اس نظریے نے تاریخ آدم میں ایسے ذلت آمیز نقوش قائم کیے جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ نسلی و وطنی قومیت کے تصور نے اقوام میں ایک دوسرے کے خلاف تعصب پیدا کیا جس کے نتیجے میں فاشزم اور نازی ازم ایسے جابرانہ سیاسی نظام سامنے آئے۔ ایک طرف مسولینی کی نظر میں اطالوی دُنیا کی بہترین قوم تھے تو دوسری طرف جرمنی کو مغالطہ تھا کہ جرمن تمام بنی نوع انسان سے اعلیٰ ہیں۔ ان دونوں حکمرانوں نے اپنی آمریت کے دور میں دُنیا کی تمام اقوام کو اٹلی اور جرمنی کی تہذیبوں میں رنگنے کے خواب دیکھے۔ دُنیا کی دو بڑی جنگیں اسی نسلی و وطنی قومیت کی بنیاد پر لڑی گئیں۔

بادشاہت اور ملوکیت کے برخلاف جمہوریت کا لفظ بڑا دلفریب معلوم پڑتا ہے، کیوں کہ اس لفظ سے ایک ایسی ریاست کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے جس میں عوام کی حکومت قائم ہو، عوام کے منتخب کردہ اہل نمائندے اپنی عوام کو استحصال سے بچاتے اور اُن کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوں، ہر قسم کی پالیسی اور قوانین بناتے وقت عوام کی پسند ناپسند کو پیشِ نظر رکھتے ہوں، مگر بدقسمتی سے ماضی میں مغرب کو میسّر آنے والی جمہوریتیں بھی ملوکیت کے جابرانہ نظام سے الگ نہیں تھیں۔ فرانس میں بادشاہ کے خلاف بغاوت ہوئی پھر بھی عوام کو سکون میسّر نہ آ سکا، کئی سیاسی گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہوئے اور جمہوریت میں بھی عوام کو دورِ دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر کشمکش آمریت پر ختم ہوئی۔ روس میں اشتراکیت قائم ہوئی مگر وہاں بھی رائے کی آزادی کی بجائے مخالفین کو چُن چُن کر قتل کیا گیا۔ آمریت خواہ کسی لباس میں بھی ہو ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس قسم کی جمہوریت کو شیطان کا ایک دل فریب ہتھکنڈہ قرار دیا ہے۔ ابلیس کا ایک مشیر جمہوریت کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتا ہے۔

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

تو دوسرا مشیر فخریہ جواب دیتا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہُوا ہے خود شناس و خود نگر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

تاریک تر جمہوری نظام وہی ہے جس کا امریکا آج بھی دلدادہ اور داعی ہے۔ آج دنیا جہاں پر جس قدر جمہوریت غیر مستحکم ہے اس میں امریکا کا کردار واضح ہے۔ اقبال کو مغرب کے سیاسی نظاموں سے خواہ وہ جمہوریت کی شکل میں ہوں یا ملوکیت کی یہی شکوہ رہا

ہے کہ یہ تمام نظام مذہب کے اخلاقی اور روحانی اصولوں سے علاحدگی کے سبب مادی اغراض کی تکمیل کے لیے کمزوروں کو نشانۂ ستم بناتے رہے ہیں۔ مسولینی کی زبانی جو کہ خود بھی مغرب کے جابرانہ سیاسی نظاموں کی پیداوار اور حصہ تھا، اس اعتراف کو اقبال نے اپنی نظم ''مسولینی'' مشمولہ ''ضربِ کلیم'' میں جس خوب صورتی سے بیان کیا ہے، اس سے مغرب کی نام نہاد جمہوریت کی قلعی کُھل کر رہ جاتی ہے یہ دو اشعار اس نظم کے دیکھیے:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

تہذیب کے پردے میں غارت گری اور آدم کشی کرنے والوں کو جب اپنی مادہ پرست اور سامراجی ذہنیت کے سبب پہلی عالمی جنگ کے نتائج بھگتنے پڑے تو اُنھوں نے لیگ آف نیشنز قائم کی جس کا ظاہری مقصد تو آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنا تھا مگر حقیقت میں اس لیگ کے قیام میں بھی بڑی طاقتوں کے اپنے مفادات و عزائم پوشیدہ تھے۔ انسانی ہمدردی کے جذبات کے برعکس مغلوب قومیں سنبھلنے کے لیے وقت چاہتی تھیں۔ جرمنی اور آسٹریا ہنگری انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ چناں چہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ طاقتوروں کے مفادات اور کمزوروں پر اُجارہ داری قائم کرنے کے لیے بنائی گئی یہ لیگ دُنیا کو دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بری طرح ناکام ہوگئی۔

اقبال کی دور بین نظریں اس لیگ کے اغراض کو بھانپ چکی تھیں۔ اُنھوں نے اس لیگ کی ناکامی کا واضح طور پر اعلان کر دیا تھا۔ نظم ''جمعیتِ اقوام'' مشمولہ ''ضربِ کلیم'' کے تین اشعار اس جمعیت کو ابلیس کی پروردہ قرار دیتے ہیں۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ میرے منھ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے لیکن
پیران کلیسا کی دُعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذوں سے کچھ روز سنبھل جائے

جمعیت اقوام کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کا کردار بھی داشتۂ پیرکِ افرنگ سے کچھ جُدا نہیں ہے اور اقبال کی لیگ آف نیشنز پر کی گئی تنقید اقوامِ متحدہ پر بعینہٖ صادق آتی ہے۔ نام نہاد جمہوریت کے علمبرداروں نے دُنیا پر اپنی اُجارہ داری قائم کرنے اور سامراجیت کو تقویت دینے کے لیے جو ادارہ قائم کر رکھا ہے امریکا کے ہاتھوں یرغمال بنا نظر آتا ہے۔ باوجود انسانی ہمدردی کے بلند بانگ دعووں کے اقوام متحدہ کی نسلی اور علاقائی عصبیت پوشیدہ نہیں ہے۔ پوری دُنیا پر اپنے نظریات اور طرزِ معاشرت مسلط کرنے کے لیے امریکہ

نے اقوام متحدہ کو ہتھیار بنا رکھا ہے اور اس کی آڑ میں خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بقول اقبال:

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

مغرب کے سامراجی نظاموں کے خلاف ہونے والا ردِ عمل اشتراکیت کی شکل میں سامنے آیا۔ اقبال نے شروع میں اشتراکیت کے بہت سے پہلوؤں کو سراہا۔ اقبال کا خیال تھا کہ اگر اشتراکیت الحاد سے تائب ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ مزدوروں کو متحد ہو کر استحصالی عناصر کے خلاف بغاوت کی تحریک کے حامی نظر آتے ہیں۔

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار جلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

واضح رہے کہ اقبال اپنے نظریات کو مادیت سے نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات سے ثابت کرتے ہیں۔ اُن کا پیغام خدائی پیغام بن جاتا ہے لیکن اقبال کا خیال تھا کہ حیاتِ انسانی صرف اقتصادیات کی تکمیل ہی کا نام نہیں۔ یہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اقبال کی نثری و شعری کاوشوں سے بہت سی ایسی تحریریں لی جا سکتی ہیں جو بائیں بازو کی معیشت کی ترجمان نظر آتی ہیں، مگر یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اقبال کے نزدیک اسلام چوں کہ ایک فطری مذہب ہے لہٰذا جب کسی قوم میں فطرت کا شعور بیدار ہوتا ہے تو اُس میں پیدا ہونے والی اچھائیاں اسلام ہی کا جزو ہوتی ہیں، گویا اُن قوموں میں اسلام ہی ظہور کرتا ہے۔ اس لیے اقبال کو یقین تھا کہ کمیونزم ایک دن اسلام میں ضم ہو جائے گا، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور وہ اسلام کی حقانیت اور ابدیت کو نہ اپنانے کی بنا پر ناکام ہو گیا۔

اقبال کی جمہوری سوچ پر جب اشتراکیت کا لیبل لگانے کی کوشش کی گئی تو اُنھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔''(۱)

اقبال اوّل و آخر مسلمان تھے مگر اُنھوں نے اپنے مذہبی نظریات کی بنا پر دُنیا کے دوسرے سیاسی نظاموں پر تنقید اور اسلامی جمہوریت کو سب سے اعلیٰ قرار نہیں دیا۔ اُنھوں نے تمام نظام ہائے سیاست کو بشمول نظام اسلامی، گہری نظروں سے پرکھا اور آخر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

نظامِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلام نے اقتصادی نظام کو کہیں نظر انداز نہیں کیا۔ پیغمبرؐ اسلام کی معروف حدیث ''فقر کفر سے نزدیک تر ہے'' اس بات کی غماز ہے کہ اسلام اضطراری فقر کو پسند نہیں کرتا۔ دولت کی تقسیم کے لیے صدقات، زکوٰۃ اور خیرات کی ترغیب اسی وجہ سے ہے کہ اسلامی ریاست میں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز نہ رہے۔ اقبال کے نزدیک تو چند عبادات بھی معاشی استحکام کے لیے لازم کی گئیں مثلاً اُنھوں نے عید الفطر کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالباً اس نماز کا حکم بھی صدقہ، فطرہ جاری کرنے کے لیے تھا تاکہ محروم لوگوں کی اعانت کی جا سکے۔(۲)

اسلام کے نزدیک سُستی، کاہلی اور جمود پسندیدہ نہیں ہے۔ قرآن حکیم ''لیس للانسان الاّ ما سعیٰ'' کہہ کر انسان کو حرکت اور جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

رسمِ شبیری صرف جہاد کا نام نہیں بلکہ کاہلی کے خلاف زندگی کی جدوجہد کا نام ہے۔ یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اُس نے سب سے پہلے اس قسم کی کاہلی اور سُستی کی مذمّت کی:

یہ اسلام ہی تھا جس نے غلاموں کو تاجِ سردار بخشا اور آقاؤں کے برابر ایک صف میں لا کھڑا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

عہد جدید میں جو چیز انسانیت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی وہ وطن و نسل پرستی ہے۔ ان بتوں کو توڑنے کا شرف سب سے پہلے اسلام ہی کو حاصل ہوا۔ توحید کے مرکز کی بدولت مسلمان ایک دوسرے سے یوں مربوط ہوئے کہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر تمام دوریاں زائل ہو گئیں۔ اسلام ہی کے جمہوری نظام نے یہ درس دیا کہ:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جمہور کی مرضی کے مطابق خلیفہ یا حکومت کا انتخاب اسلام ہی سے ماخوذ ہے۔ عوام کے یہ منتخب نمائندے ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ کوئی بھی معمولی آدمی کسی بھی وقت خلیفہ کو عدالت میں طلب کر سکتا تھا اور اُس سے باز پرس کا حق رکھتا تھا۔ یہ خلیفہ شب گئے بھیس بدل کر نکل جاتے تاکہ عوام کے حالات کا جائزہ لیں۔ ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لیے پیٹھ پر خوراک لاد کر لے جاتے۔ سوائے اسلامی جمہوریت کے ایسی مثالیں کسی دوسرے سیاسی نظام میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

غرض یہ کہ انسان کو عالم گیر اخوت کے رشتے میں جکڑنے کے لیے مادّی مفادات کا اشتراک کافی نہیں جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی قدر تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس رشتۂ اخوت کے لیے ایک ایسے روحانی مرکز کی ضرورت ہے جو افراد کو محض مادی اغراض کی خاطر انسانیت دشمنی سے باز رکھے۔ اسلام عالمی اخوت کے اس روحانی اصول کو توحید کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کا جمہوری نظام دنیا کے دیگر سیاسی نظاموں کی طرح افراط وتفریط کا شکار نہیں۔ اس میں فرد کی مادی اور روحانی دونوں قسم کی ضروریات کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ قرآن کریم اس جمہوری نظام کا آئین ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

''قرآن زندگی کو اس کی تمام وسعتوں، پہنائیوں اور امکانوں کے ساتھ دیکھتا ہے اور شکم و جنس سے لے کر قلب و روح کے انتہائی لطیف تقاضوں تک ہر ایک ضرورت اور حاجت کی تکمیل و تسکین کا سامان کرتا ہے۔'' (۳)

اقبال نے ایک ایسی آزاد جمہوری ریاست کا خواب دیکھا تھا جس میں معاشی و معاشرتی مساوات قائم ہو، انسانی جذبات و احساسات کا احترام کیا جاتا ہو، معاش کے ذرائع سے اعلیٰ طبقوں کی بالادستی ختم ہو اور کسب معاش کے یکساں ذرائع عوام کو حاصل ہوں۔ قومی اسمبلی نظریۂ ضرورت کے تحت قوانین وضع نہ کرے بلکہ قرآن کے احکامات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قانون تشکیل دیا جائے۔ ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہو، اور یہ ریاست معاشی و معاشرتی مساوات کی علمبردار بن کر دُنیا کے نقشے پر اُبھرے۔ ایسی ریاست جس میں نااہل حکمران بن جائیں اور عوام بُرے بھلے کی تمیز کیے بغیر ان نمائندوں کو منتخب کرلیں، خواہ یہ انتخاب جبر کی بنا پر ہو یا اختیار کی بنا پر، جو سامراج کی طرح دولت سمیٹے ہوں، عوام کے جذبات کو پامال کرتے اور حقوق کو غصب کرتے ہوں۔ اقبال کی نظر میں ایسی جمہوریت قابل قدر نہیں جو صرف چند طبقات کے مفادات کا خیال کرے بلکہ ہر طرح سے جمہور کا خیال رکھے۔

حواشی

(۱) ایس۔ اے رحمان، ڈاکٹر، اقبال اور سوشلزم (خط بنام ایڈیٹرز میندار) (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۸ء) ص ۳۸

(۲) سید عبدالواحد معینی، مقالاتِ اقبال، خطبہ ''عیدالفطر'' (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء) ص ۲۸۴

(۳) پروفیسر محمد عثمان، حیات اقبال کا ایک جذباتی دور (لاہور: مکتبہ جدید ۱۹۷۵) ص ۶۹

(کتابیات)

(۱) ایس۔ اے رحمان، جسٹس، اقبال اور سوشلزم (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۷۸)

(۲) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء)

(۳) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکرِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۷۷ء)

(۴) اقبال، کلیات اقبال (اُردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۲ء)

(۵) محمد عثمان، پروفیسر، حیات اقبال کا ایک جذباتی دور (لاہور: مکتبہ جدید ۱۹۷۵ء)

(۶) محمد منور، پروفیسر، ایقانِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۸۸ء)

(۷) سید عبدالواحد معینی، مقالاتِ اقبال (لاہور: آئینہ ادب ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر سید وسیم الدین☆

کتاب ''اقبال اور عشقِ رسول ؐ'' کا مطالعہ

''اقبال اور عشق رسول ؐ'' سید رئیس احمد جعفری ندوی کی وہ کتاب ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور اس کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جناب سید رئیس احمد جعفری ماہر اقبالیات مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے حوالے سے آپ کی کتابیں اور آپ کے نقطۂ نگاہ کو اہل زبان و ادب انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کو جو اقبال حاصل ہوا وہ یقیناً ''حبِّ رسول ؐ کا عطیۂ خاص تھا کہ آپ نے اردو ادب میں رفعت عظیم حاصل کیا۔ غالب کی شاعری کے بعد اگر کسی کو بے پناہ پذیرائی میسر آئی ہے تو وہ اقبال ہی ہو سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کے متعدد گوشوں پر تحقیقی، علمی، تنقیدی اور تخلیقی مضامین لکھے جا رہے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہم سو سال کے بعد بھی عہدِ اقبال کے دائرہ سے باہر نہیں نکل پائیں گے۔

محترم مصنف نے اپنی اس کتاب میں متعدد شعرا کا ذکر کیا ہے اور یہ ذکر نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی تناظر میں ہے۔ اس میں انھوں نے فارسی کے نعت گو شعرا میں حسان بن ثابت، شیخ سعدی، فیضی، نظامی گنجوی، حکیم سنائی، فریدالدین عطار، حافظ خواجہ، عرفی، امیر خسرو، قدسی، ظہوری، ناصر علی سرہندی، نظیری نیشاپوری، مرزا غالب، گرامی، اور جگر کا ذکر کیا ہے۔

اردو کے نعتیہ کلام میں خواجہ الطاف حسین حالی، شاہ عظیم آبادی اکبرالہ آبادی، اصغر گونڈوی، مولانا ظفر علی خاں، اقبال احمد سہیل، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، ماہرالقادری، روش صدیقی، حسرت موہانی اور اردو زبان کے تین نعت گو شعرا امیر مینائی، محسن کاکوروی اور بیدم شاہ وارثی، کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ جناب رئیس احمد جعفری نے اردو نعت گو شعرا میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ مولانا کی نعتیہ شاعری صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام و اقوام میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور ڈاکٹر علامہ اقبال بھی ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ اردو زبان و ادب کے قد آور شاعر حضرت داغ دہلوی بھی مولانا کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ایک موقع پر کہتے ہیں کہ اگر مولانا غزل کی جانب رُخ کرتے تو وہ کئی بڑے شاعروں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیتے۔

اس کتاب میں فنکارانہ نعت گوئی کے ضمن میں جن شعرا کا ذکر ملتا ہے ان میں سودا، بہادر شاہ ظفر، مومن خان مومن، میر حسن، نظیر اکبرالہ آبادی، ذوق، داغ اور ڈاکٹر اقبال کے عہد کے نعتیہ کلام میں مولانا ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی اور حرم حمید صدیقی کا ذکر ملتا ہے۔

☆شعبہ بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ، جامعہ اردو، کراچی

اس کتاب کا آخری باب ''اقبال اور ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس میں مختلف موضوعات ہیں ان میں سب سے چند درج ذیل ہیں۔

خواب گاہِ مصطفیٰ، اسلام تیرا دین ہے تو مصطفوی ہے، خواب گاہِ نبیؐ پر فریاد، چراغ مصطفوی اور شرارِ بولہبی، دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا کردے، نگاہِ محمد عربی، سیرۃ النبیؐ، ذکر مصطفیٰ، مردِ حق، تلاش مصطفیٰ، معراجِ مصطفیٰ، فروغ وادیٔ سینا، مولائے یثرب، لوح بھی تو قلم بھی تو، قلب ونظر کی زندگی، عشق تمام مصطفیٰ، صحرانشیں کا حجازِ لذتِ پرواز، اے روح محمد، محمد عربی اور عالم عربی، منزلِ مقصود واردات مصطفیٰ، رمزِ دین مصطفیٰ، خرقۂ مبارک، حکمت کلیمی، متاع مصطفیٰ، مالِ صالح، روئے پاک مصطفیٰ، حمد بے حد، معجزۂ شق القمر، اُمّی عرب، بہ حضور رحمت العالمین، وجد و کیف، نگاہِ یا رسول، جوش وشوق، سوئے یثرب، موئے یثرب، پیامِ شوق، کیفیات عشق راہِ مصطفیٰ، مستی و سوز، گیتی پناہ، شرع پیغمبر، سوز وساز اور باقیاتِ اقبال قابلِ ذکر ہیں۔

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ ''اقبال کی تعلیم کسی مسجد اور مکتب میں نہیں ہوئی، انھوں نے عربی کی تحصیل وتکمیل نہیں کی۔ انھوں نے کسی خانقاہ سے فیض نہیں اُٹھایا۔ انگریزی کی تعلیم حاصل کی فرنگیوں کے ملک میں جا کر اُس کی تکمیل کی۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ ذہن ودماغ کی ساری صلاحیتیں اس فن کی تعمیل وتکمیل پر صرف کردیں۔ اقبال کا زمانہ وہ تھا جب عام طور پر فلسفی کے معنی گویا مذہب بیزار شخص کے ہوتے تھے! ایک فلسفی کی اس سے بڑھ کر توہین کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس پر مذہب پرستی کا الزام لگا دیا جائے۔ اس زمانے کے روشن خیال، آزاد طبع، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فلسفیانہ مزاج وطبیعت رکھنے والے اصحاب کے لیے مذہب صرف ایک تاریخی مشغلہ تھا، عبادت اور ریاضت اُن کے نزدیک وقت ضائع کرنے کا مشغلہ تھا، مسلمانوں کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی کہ جس پر وہ فخر کرسکیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ڈاکٹر اقبال اس ساری مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے دیارِ فرنگ کا ہر رُخ دیکھا۔ ہر جلوہ کا نظارہ کیا، کوئی پہلو ایسا نہ تھا جسے ٹٹولا اور پرکھا نہ ہو لیکن نہ انھیں اپنے مذہب پر ندامت ہوئی اور نہ اپنے اسلاف پر اور جب علوم عصریہ اور فنون جدیدہ اور حکمت مغربی اور فلسفۂ فرنگ کا محرم راز بن کر اپنے دیس میں واپس آئے تو ان کی زبان پر جو ترانہ تھا وہ یہ تھا کہ:

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ڈاکٹر اقبال کو اقبال سے آگاہی اس وقت حاصل ہوئی جب وہ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متاعِ دولت سے مالا مال ہوئے اور اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا کہ:

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت ومحبت نے اُن کی شاعری میں اجالا پیدا کردیا ان کا شعر دیکھیے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا کردے

اقبال فرماتے ہیں:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یسین وہی تو

رئیس احمد جعفری اپنی اس کتاب میں ایک جگہ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ ''ذکر رسول کا ترانہ جب اقبال کی زبان پر جاری ہوتا ہے تو ان کی بے خودی، سرخوشی اور والہانہ جذب و کیف کا عالم قابل دید ہوتا ہے یہ ذکر جمیل اُن کے سمندر سخن پر تازیانہ کا کام کرتا ہے اور ان کی زبان سے شعروں کی بارش ہونے لگتی ہے یہ اشعار چوں کہ دل سے نکلتے ہیں اس لیے ان کا کیف و تاثر کچھ دوسرے ہی رنگ کا ہوتا ہے۔ الفاظ میں جادو، اندازِ بیان میں سحر حلال، ترکیبوں اور بندشوں میں شوق و مستی، خیالات میں بے خودی یہ ہے اقبال کے نعتیہ کلام کی خصوصیت امتیازی جو دوسروں میں نہیں ملتی۔

میں رئیس احمد جعفری کو اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اقبال کے ہاں نعتیہ کلام کا ایک عجیب ہی رنگ ہے، مثلاً اقبال کی ایک نعت جو میں یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اگر دورِ جدید کے شاعر ایک جگہ بیٹھ جائیں اور اس معیار کی نعت پیش کرنے کی سعی کریں تو شاید اُن کے لیے یہ امر انتہائی مشکل اور محال ہوگا نعت یہ ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آب گینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکت و سنجر سلیم تیرے جلال سے نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

ڈاکٹر اقبال آداب عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے تو انھوں نے آپ کو فخر کائنات اور مالک لوح و قلم کہا ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ:

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تیری — میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوا اللہ کے آگ ہے تکبیر تیری — تو مسلماں ہے تو تدبیر ہے تقدیر تیری
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ڈاکٹر اقبال کے نزدیک جو مسلمان عشق رسولؐ سے سرشار ہے وہ طوفانوں سے لڑ سکتا ہے، سمندروں سے ٹکر لے سکتا ہے، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے، وقت کے فرعونوں اور سورماؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بادشاہت اور قیصریت کا تختہ اُلٹ سکتا ہے اس لیے کہ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس میں ملوکیت اور قیصریت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کا نظام اسلامی اصولوں پر مشتمل تھا اور اس نظام میں کسی قسم کی تفریق مسلمانوں میں نہ تھی۔

ملت مسلم کے لیے اقبال کا صرف ایک پیغام ہے، وہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب واپسی کا راستہ، اس کے علاوہ ہر تحریک، ہر نعرہ اور ہر نظریہ کو وہ مسلمان کے لیے تباہ کن اور ہلاکت خیز سمجھتے ہیں۔ اسی لیے تو انھوں نے برملا کہا تھا کہ:

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صبر لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر — اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

محمد تقی خان☆

اقبال کی قدر و قیمت

کلام اقبال کی قدر و قیمت معلوم کرنے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔ اقبال کے کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ کیے بغیر ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک و احساس آسان نہیں ہے۔ یہ فیضان ہے عشق رسول کا جس نے اُن کے کلام کو گراں مایہ اور لازوال بنا دیا۔ یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر مسلمان کا مذہبی اور تہذیبی معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار میں کس قدر عشقِ رسول پنہا ہے۔

اقبال سچے عاشق رسول تھے اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی میں وہ واحد نمونہ زندگی ہے جو انسانیت کے قافلے کو عافیت اور امن کے ساتھ اس کی فلاح و سلامتی تک لے جاسکتی ہے۔ ہر مسلمان اس میں اپنی تمام فکری، اقتصادی اور روحانی و اخلاقی بیماریوں کا شفا بخش علاج پائے گا۔ اقبال چاہتے تھے کہ یہ ہی نمونہ سب مسلمانوں کا ہو جائے۔

اقبال کا کلام اسلام کے زیر اثر قنوطیت و مایوسی کو رد کرتے ہوئے ہمیں امید کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال کی شاعری زندہ ہی اس لیے کہ وہ ہمیں حوصلہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری اس پُر آشوب دور کی تاریکی میں شمع کی روشنی کی مانند ہے جس کے ذریعے ہم خوشی و مسرت کے راستے تلاش کر سکتے ہیں۔ یہی آفاقی ادب کی نشانی ہے۔ اقبال جہاں عظمت انسان کی بات کرتے ہیں وہاں وہ انسان کے روشن مستقبل کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا قدر کا عذر پیش کرنا ایک مومن کا کام نہیں۔ اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے حامل ہیں۔

(بحوالہ نقوش اقبال، ص ۱۲۱ تا ۱۲۲)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆176۔ طارق بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

اقبال کے ہاں مومن کا تصور خیالی نہیں، بلکہ وہ عمل پیہم سے اپنی زندگی کو نکھارتا اور سنوارتا ہے۔ اقبال جابجا یہ ہی پیغام دیتے ہیں اور مایوسی کو عظمت انساں کے لیے گناہ تصور کرتے ہیں۔

دراصل یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لیے وجود میں آئے ہیں، وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے اس کائنات کا تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

امنگیں مری، آرزوئیں مری، امیدیں مری، جستجوئیں مری
مرا دل رزم گاہ حیات، گمانوں کے لشکر یقیں کائنات

یہی کچھ ہے ساقی حنائے فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں امیر
میرے قافلے میں لٹا دے اسے
لوٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

رشید احمد صدیقی مرحوم کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کی گرفت بھی مجھ پر اس لیے ہے کہ انھوں نے ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کے لیے لکھا اور مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر روشن مستقبل اور روشن خیالی کی راہ پر گامزن کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک مضمحل اور افسردہ نوجوان اقبال کے پاس بیٹھا اپنی زندگی کی ناکامیوں اور اپنے بخت کی نارسائیوں کا رونا رو رہا تھا۔ انھوں نے اسے ہمت حوصلہ اور استقلال کا درس دیتے ہوئے کہا۔

''دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد صرف عمل ہے، قرآن کہتا ہے کہ جن و انس کی پیدائش ہی اس لیے ہوئی ہے کہ عبادت کرے یہاں عبادت سے مراد عمل بھی ہے ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے اور اپنی تخلیقی قوتوں کو ضائع کرنے کا نام گناہ ہے، دنیا میں پیغمبر اس لیے آئے ہیں کہ لوگوں کو بتائیں کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام برا ہے۔ اس لیے آپ کامیابی اور ناکامی کا خیال کیے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔''

ایک روز کسی مقامی کالج کے چند طلبا ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اسلامی مساوات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے

لگے۔ میں آپ کو صرف ایک نصیحت کرتا ہوں اور آپ میری رائے کو عام کر دیجیے۔ ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ذات پات کی لعنت کو یکسر ترک کر دے۔ جب کبھی آپ کی اپنی ذات بتلانے کی ضرورت پیش آئے آپ اس بات پر اصرار کیجیے کہ ہماری ذات مسلمان ہے، ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ ہر عقیدے کے مطابق مسلمان کے پیچھے جس کا توحید و رسالت پر ایمان ہے نماز پڑھے، ہر ہندوستانی مسلمان خواہ وہ امیر ہے یا غریب اس کا فرض ہے کہ بے کاری کو خدا حافظ کہہ دے اور اپنے دست و بازو سے کچھ نہ کچھ ضرور کمائے۔

پروفیسر جی سی چٹرجی لکھتے ہیں کہ:

''ایک لحاظ سے اقبال ایسے شاعر اور فلسفی تھے جنھوں نے اسلامیات میں جدت کی روح پھونکی۔ آپ کے نقطۂ نظر سے اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے جو انسان کی تقدیر اور اس کی ناقابل فتح روح کے تمام امکانات پر حاوی ہے جو ''عالمگیر اسلامیات'' آپ قائم کرنا چاہتے تھے وہ قدامت پسندی کا کوئی تنگ دائرہ نہ تھی بلکہ بڑے دلوں اور بلند ذکر دماغوں کی مستحکم جمہوریت تھی۔''

ذرا اقبال کا یہ کلام دیکھیے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کھیل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سرداراں

آنکھ کو بیدار کر دے وعدہ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو نور جوہر گفتار سے

نوجواں مسلم کے لیے دعا

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

اقبال جس پُرآشوب دور میں شاعری فرما رہے تھے اس وقت اُمت مسلمہ پر بڑی افتاد آن پڑی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے مسلمان قوم کو اپنی شاعری سے نہ صرف جگایا بلکہ تڑپایا بھی۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اقبال نے محنت کش طبقہ کے درد کو بھی محسوس کیا کہ کس طرح سرمایہ داران کی محنت دولت کا انبار لگاتے ہیں اور مزدور بے چارہ فاقہ مستی اور تنگ دستی میں دن گزارتا ہے۔ سرمایہ دار عیش و تعیش میں شب و روز گزارتا ہے اور مزدور کو زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹنی پڑتی ہے۔ انھوں نے محنت کش طبقہ کے لیے جو اشعار کہے ان سے اقبال کی عظمت اور انسان دوستی کا احساس ہوتا ہے:

بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

ان اشعار سے اقبال کی پسے ہوئے طبقے کی انسان دوستی مترشح ہوتی ہے اور مزدور اور محنت کش طبقے کی محبت:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اُن کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا کہ تدبر کرو، مسائل سے نہ ڈرو اور جدوجہد کرو، اسی میں تمھاری بڑائی ہے اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا اور فکر کو جذبات کو آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کارفرما تھے یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اقبال جیسا بڑا شاعر و فلسفی ہمارے حصّے میں آیا۔ ایک ایسا شاعر جس کا کلام ہمیں ہدایت کی راہ دکھاتا رہے گا، ایک ایسا فلسفی جس پر ہم اس کی فکر کے اعتبار سے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔

غالب کی بعض تصانیف

از

کالی داس گپتا رضا

صفحات: ۱۵۴ قیمت: ۱۲۰ روپے

نسیم عباس احمر☆

راشد کی تین نظموں کا متنی اشتراک

ہر شعری تخلیق، اپنے تخلیقی بطن میں ایک وجود رکھتی ہے مگر اس سے باہر نمایاں اور عیاں وجود (فن پارہ) حقیقی تخلیق کار کی تخلیقیت سے دستبردار ہو کر، قاری کو متن میں مضمر تخلیق کار کا سراغ دیتا ہے۔ متن میں تحلیل شدہ مصنف/شاعر اپنے تخلیقی اور نظریاتی ادراک سے قاری کو گرفت میں لینے کی بھرپور سعی کرتا ہے، بعدہ قاری متن کی تفہیم، تعبیر اور تفسیر میں فعال نظر آتا ہے جس سے شخصیت کے سماجی پہلوؤں، شخصی تصورات، ادبی نظریات، جمالیاتی شعور اور نفسیاتی تجربے کا اظہاریہ بطور خاص ملتا ہے لیکن کبھی کبھار تخلیق کار، متن کے وجود میں من وعن، متنی تبدیلیوں کے ساتھ واضح نظر آتا ہے اور ایک ہی تخلیق، چند متنی تبدیلیوں کے ساتھ تو کئی عنوانات والی تخلیق بن جاتی ہے۔ متن کے ان مشترک انسلاکات کا اظہار ایک تخلیقی احساس میں پیچیدگی کو واضح کرتا ہے۔ یہ انسلاکات متن میں خاص اہمیت حاصل کر جاتے ہیں جس کی نشاندہی اُن انسلاکات کو غیر موثر نہیں بناتی بلکہ یہ کھلا ڈھلا اور غیر جانبدارانہ انداز نظموں کے افہام، ترسیل اور جمالیاتی پیکروں پر واضح نظر ڈالنے کے ساتھ مصنف/شاعر کے تخلیقی عمل میں پیچیدگی (جو کہ تبدیلیوں کی مختلف جہتوں کی ضامن ہے) کا احساس دلاتا ہے۔

اس مطالعے میں ن۔م۔ راشد کی تین نظموں:

۱۔ ''ریگ دیروز'' (مطبوعہ ادبِ لطیف، جولائی ۱۹۵۵ء)

۲۔ ''ریگ دیروز'' (مشمولہ کلیات، ماورا، لاہور، ۲۰۰۰ء)

۳۔ ''تصوف'' (مشمولہ کلیات، ماورا، لاہور، ۲۰۰۰ء) (یہ نظم کسی مجموعے میں شامل نہیں تھی)

کے متون میں موجود متن کی یکسانیت (تین نظموں میں لفظی متنی اشتراک ہے) اور عنوانات کے اختلاف کو بہ نظرِ غائر دیکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ شعری متن کے لفظی اشتراک کی بات کی جائے۔ ریگِ دیروز (مطبوعہ ادبِ لطیف، ۱۹۵۵ء) اور ریگِ دیروز (مشمولہ کلیات، ماورا، لاہور ۲۰۰۰ء) کے متنی اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں۔

☆لیکچرار شعبۂ اردو، سرگودھا یونی ورسٹی

''ریگِ دیروز'' (ادبِ لطیف، لاہور ۱۹۵۵ء)

تو محبت کے خرابوں کا مکیں

کنجِ دل میں کسی باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ

جو کسی فتنہ ناگاہ سے ڈر کر چونکے

تو رہیں بندِ نگہ نیند کے بھاری پردے!

تو محبت کے خرابوں کا مکیں

ایسے تاریک خرابے کے جہاں

دور سے تیز پلٹ جائیں وفا کے آہو!

ایسے سنسان خرابے کے جہاں

اک صدا گونجتی ہو

وہ بھی آلام کہن سال کی یا ہو، یا ہو

تو محبت کے خرابوں کا مکیں

ریگ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتا رہا

سایہ ناپید تھا

سائے کی تمنا کے تلے سوتا رہا

''ریگ دیروز'' (مشمولہ کلیات، ماورا، لاہور، ۲۰۰۰ء)

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں

وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں

ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا

اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا!

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بسنے والے

اپنی پامالی کے افسانہ پہ ہنسنے والے

ہم سمجھتے ہیں نشانِ سحرِ منزل پایا!

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں

کنجِ ماضی میں ہیں باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ

اور کبھی فتنۂ ناگاہ سے ڈر کر چونکیں

تو رہیں سدِّ نگاہ نیند کے بھاری پردے

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں!

ایسے تاریک خرابے کے جہاں

دور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہو

ایک، بس ایک، صدا گونجتی ہو

شبِ آمدم کی ''یا ہو! یا ہو!''

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں

ریگ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتے رہے

سایہ ناپید تھا، سائے کی تمنا کے تلے سوتے رہے!

ایک عنوان کے تحت نظموں کے متن میں فرق نمایاں ہے، اس فرق کی مدد سے دونوں نظموں میں صیغۂ واحد غائب (تو) صیغہ جمع متکلم (ہم) ''کنجِ ماضی — کنجِ دل''، ''بند نگہ — سدِّ نگاہ''، ''وفا کے آہو — ضیا کے آہو''، ''وہ بھی آلامِ کہن سال کی یا ہو، یا ہو — شبِ آلام کی یا ہو! یا ہو'' کی مختلف صورتوں اور شکلوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ راشد نے ادب لطیف میں مطبوعہ نظم میں اپنے تخلیقی احساس کو پیہم اظہار کیا ہے۔ مگر جب انھوں نے اس نظم پر کیا تو انھوں نے اپنے تخلیقی اپج سے اس احساس کو دوام کرنے کی کوشش کی کہ تخلیق کار کہیں غائب یا گم نہ ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے اپنی تخلیقی رشتہ ''ہم'' سے استوار کیا تا کہ محبت کے خرابوں کا مکیں محض تو نہ رہے بلکہ ہم ہیں۔ ''تو'' کی ''ہم'' سے ترمیم ایک مخصوص ذاتی رجحان اور زندگی کے غیر مشروط ہونے کا اعلامیہ ہے جسے انھوں نے اپنی تخلیقی وابستگی سے آگے بڑھایا ہے۔ راشد کا یہ تخلیقی شعور، لفظوں کے ادراک سے اظہار تک، پھر اظہار سے ترسیلِ معانی تک، جو ایک قرینہ وضع کرتا ہے: وہ ان کی کیفیات و تجربات کو اجتماعی کردار کی نفسیاتی تعبیر اور بصیرت سے معنی خیز بناتا ہے۔ تخلیقی منصب کی یہ کارفرمائی، ان کے تخلیقی رویوں اور شخصی زاویوں کے مختلف احساسات کا تاثر دیتی ہے۔ جو اجتماعی کرداروں سے زندگی کے نئے رشتوں کی پہچان ہے۔

''ریگ دیروز'' (مشمولہ کلیات، ماورا، لاہور، ۲۰۰۰ء)

ہم تصوف کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!
ہم جو صدیوں سے چلے ہیں
تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی دن رات کی پاکوبی کا حاصل پایا
ہم تصوف کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا

''ریگ دیروز'' اور ''تصوف'' کے متن میں اشتراک، نظم کے تخلیقی امکانات کو محدود کرتا ہے اور نظم کے پس منظر میں موجود شاعر محبت اور تصوف کے انفراد کو ایک ہی متن سے تشکیل دینے کی سعی کرتا ہے۔ یہ واضح عکس نظم کے مفروضات ہیں۔ یہ مفروضات تخلیق کار کے تخلیقی عمل میں موجود شعری وژن کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس تخلیقی عمل کی بازیافت، پہلے سے موجود متن کی ازسرِ نو تشکیل سے ہوتی ہے۔ مگر یہ تشکیل دو لفظوں ''محبت'' اور ''تصوف'' کے درمیان ہے محبت اور تصوف کی یہ نفسیاتی جہت جس تخلیقی شعور کا سراغ دیتی ہے وہ تخلیقی شعور ان نظموں کے متن میں مسخ شدہ بھی ہے اور فاصلے پر بھی — یہ مخصوص فضا، جن مخفی ابعاد کو واضح کرتی ہے ان کی صورتِ حال قاری کو پریشان کرتی ہے کہ یہ بظاہر شعوری مظاہرہ، لاشعوری تو نہیں؟ ممکن ہے یہ لاشعوری ہی ہو مگر باطن میں پیوستہ حقیقتیں اپنے اظہار کے لیے داخل اور باطنی رُخوں کا سہارا لیتی ہیں۔

مذکورہ نظموں کی بنیادی ساخت میں زندگی کی اجنبیت، تصوف کی اپنائیت اور محبت کے علامتی مفاہیم ملتے ہیں جو معانی کی تشکیل اور افہام کو وسعت بھی دیتے ہیں اور ذہنی و فنی ارتقاء کا ثبوت بھی۔

خطوط عبدالحق بنام آلِ احمد سرور

مرتبہ: پروفیسر آلِ احمد سرور

قیمت ۶۰ روپے

☆☆☆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ☆

حفیظ جالندھری۔ ایک منفرد گیت نگار

اردو شعروادب کی بعض اصناف کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ایسے ہیں، جن سے شعرائے کرام نے سوتیلی اولاد کا سا سلوک کیا اور انھیں لائق توجہ نہ سمجھتے ہوئے ان سے اغماض برتا۔ ان مظلوم اور معتوب اصناف میں سے ایک اہم صنف گیت بھی ہے۔ اس اغماض و بے توجہی کے باوجود بعض معتبر اور مستند شعرائے کرام نے اس صنف کی کسی حد تک پذیرائی بھی کی ہے۔ ان شعرائے کرام میں حفیظ جالندھری قابلِ قدر حیثیت کے مالک ہیں اور آج گیت کی صنف اور حفیظ جالندھری کا نام لازم وملزوم ہو چکے ہیں۔

گیت کیا ہے؟ یہ مسئلہ ماہرینِ موسیقی اور ناقدینِ ادب کے درمیان ہنوز تنازعہ ہے۔ معروف ماہر موسیقی ایم۔ محتشم (انڈین میوزک) کے خیال میں گانا تو دراصل گلے سے سروں کو ترتیب اور دل کشی کے ساتھ ادا کرنے کا نام ہے اور جب سروں سے کسی زبان کے الفاظ ادا کیے جائیں تو ان الفاظ کے مجموعے کو گیت کہتے ہیں، البتہ اس میں تال کی قید بھی ضروری ہے۔ جب کہ میرا جی کے نزدیک سب سے پہلے آواز بنی۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے سُر بنے، سُروں کے سنجوگ سے بول نے جنم لیا اور پھر بول گیت بن گئے۔ بعض ناقدینِ ادب فقط عورتوں کے جذبات واحساسات کی غنائی پیشکش کو گیت قرار دیتے ہیں بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا تو گیت میں عورت کا حسن، آواز، جسم کا لوچ غرض صنف نازک کے حسن کے تمام پہلو اور ساری نسوانیت کو مجتمع دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ گیت نسوانی جذبات واحساسات کی نمائندہ صنفِ سخن ہے تاہم اسے فقط اس اندازِ فکر کا حامل قرار دینا ادبی ناانصافی ہے۔

گیت کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اور پہلا گیت نگار کون ہے؟ یہ بھارت ہنوز حل طلب ہے۔ تاہم اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں قدیم برصغیر کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔ گیت دراصل برصغیر کے تہذیبی، سیاسی اور روحانی حالات اور کشمکشوں کی دین ہے۔ ان گیتوں میں برصغیر کے بسنے والوں نے اپنی تخیلی اور جذباتی سطحوں کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ بعض ناقدین ادب گیت کی تاریخ کو مہاراج کرشن اور بھگوان وشنو سے منسوب کرتے ہیں اور بعض ناقدین تو کالی داس کے ڈراموں میں سے بھی باقاعدہ اور بے قاعدہ گیتوں کو تلاش کر لیتے ہیں تاہم ڈاکٹر وزیر آغا گیتوں کے باقاعدہ فروغ کے زمانے کو مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے ساتھ مشروط قرار

☆F/253، رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

دیتے ہیں۔ تاریخِ ادب شاہد ہے کہ برصغیر میں گیتوں کا اظہار مقامی زبانوں اور خصوصاً ہندی زبان میں زیادہ ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان کا ابتدائی سرمایا اس معروف صنفِ سخن سے تہی دامن ہے۔

اُردو گیت نگاری کی تشکیل وتعمیر میں یوں تو بہت سے شعرا کی کارگزاریاں قابلِ ذکر ہیں تاہم امیر خسرو اور میرا بائی کے گیتوں کی شہرت ومقبولیت نے اُردو زبان کے شعرا کو گیت نگاری کی جانب سے متوجہ کیا۔ ان دونوں گیت نگاروں کا لگایا ہوا پودا ثمر دار ہوا اور اس صنفِ سخن میں امانت لکھنوی جیسا گیت نگار پیدا ہوا۔ ''اندر سبھا'' کے گیتوں کا فنی مرتبہ کچھ بھی ہو گیت نگاری کی روایت میں اسے ضرور اہمیت دی جانی چاہیے۔ اُردو گیت نگاری میں آرزو لکھنوی نے پہلی مرتبہ گیتوں کو فنی معیار سے آشنا کیا اور شاعری اور موسیقی کا رشتۂ ازلی مستحکم کیا۔ یہی سبب ہے کہ آرزو لکھنوی کے گیتوں میں جو خاص نکھار، فنی کمال اور انفرادیت ہے وہ دوسرے گیت نگاروں کے ہاں مفقود ہے۔ اردو گیت نگاری کے فنی وفکری ارتقا کے سلسلے میں اگلا قدم عظمت اللہ خاں نے اُٹھایا۔ انھوں نے ایسے گیت پیش کیے جو گھسی پٹی ہندی تراکیب کے تسلط سے آزاد تھے اور اس طرح عظمت اللہ خاں ایک خاص اسلوب کے موجد ٹھہرے۔ اس معتوب صنف کی قسمت بدلنے اور اس کا فنی معیار متعین کر کے اسے معتبر بنانے والوں میں اختر شیرانی اور میراجی کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان حضرات نے اپنے گیتوں میں فکری اور معنوی ہیئتیں پیدا کیں اور اس صنفِ سخن کو بلند قامت کر دیا۔ اُردو گیت نگاری کی روایت کو جس شخص نے استحکام بخشا، فکر واسلوب کے اعتبار سے اس میں ندرتیں اور جدتیں پیدا کیں اور عوام الناس میں مقبول کیا وہ حفیظ جالندھری ہیں۔

ہر عظیم فن کار ایک ہی وقت میں دو کام سرانجام دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی تخلیقی کاوش میں تہذیبی روایات کو سموتا ہے اور دوسری جانب وہ موجودہ روایتی سرمائے میں اپنے انفرادی لب ولہجے کے ساتھ بیش بہا اضافے بھی کرتا ہے۔ یہ دونوں عوامل سہل نہیں اور ان کی انجام دہی میں جگر کو بڑی خوش سلیقگی سے خون کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے حفیظ جالندھری قابلِ ستائش ہیں کہ ان کے گیتوں میں روایت کی پاسداری بھی ملتی ہے اور نئے شعری وفکری تجربے بھی۔ ان کے گیتوں میں ہندی اور اُردو گیت نگاری کے مروجہ موضوعات واسالیب بھی ہیں اور نئے شعری نظام سے منسلک افکار بھی۔ اس لحاظ سے اردو گیت نگاری کی روایت میں حفیظ جالندھری کا مقام دوسرے اصنافِ سخن کی نسبت زیادہ معتبر اور مستحکم دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اس مقام کو سمجھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ:

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ، درد کے گیت گا سکے

انسانی زندگی طربیاتی اور المیاتی عناصر کی ترکیب سے تشکیل پاتی ہے۔ یہی عناصر بعد میں تہذیبوں کی تخلیق وتعمیر میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ عظیم انسانی زندگی اور اعلیٰ تہذیب کی واضح نشانی یہ ہے کہ اس میں المیاتی اور طربیاتی عناصر توازن واعتدال سے موجزن ہوتے ہیں۔ بڑا شاعر وہی قرار پا سکتا ہے جس کی شاعری میں طربیاتی اور المیاتی عناصر توازن سے ہوں ورنہ عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعر یا تو رنگین بن جائے گا یا محض فانی بدایونی۔

حفیظ جالندھری نے رومانی شاعری کے زمانۂ عروج میں اپنی شاعری کا آغاز کیا، لہٰذا رومانوی شعری رویہ ان کی تخلیقات میں بھی سرایت کر گیا۔ رومانوی شاعری جذبہ و تخیل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور تخیل کی بلند پروازی کے نتیجہ میں شاعری میں طربیہ عناصر کی بہتات کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ یہی سبب ہے کہ حفیظ کی شاعری میں نالۂ دل بھی نغمۂ رباب بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طربیہ رجحان اور لب و لہجے کی فراوانی کے سبب سے ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے انھیں نغمۂ رباب کا شاعر قرار دیا ہے۔

حفیظ جالندھری کے گیتوں کا ایک نمایاں وصف سرمستی اور ہیجان ہے۔ یہ ہیجان دراصل طربیاتی عناصر کی آب یاری کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حفیظ کے گیتوں میں حزنیہ عناصر بہت کم دکھائی دیتی ہے اور حیات کش عناصر کی بیخ کنی بھی ان گیتوں کی ایک اہم خوبی دکھائی دیتی ہے۔ طربیہ عناصر کے کثیر استعمال کی وجہ سے پیدا شدہ یہ تازگیِ فکر موضوعات اور اسالیب دونوں میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ معروف گیت ''جاگ سوزِ عشق جاگ'' میں موضوع اور اسالیب دونوں میں سرمستی اور ہیجان کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں:

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے راگ رنگ جاگ اُٹھے

جوگ سے ملے بہاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

.....

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ اے نظر فروز جاگ اے نظر فراز
جاگ اے زمانہ سوز جاگ اے زمانہ ساز

جاگ، نیند کو تیاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

.....

اسی طرح ''پریت کا گیت'' نامی گیت کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے او مورکھ او بھولے بھالے

دل کی دنیا کر لے روشن اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی بھول گیا او بھارت والے

بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسالے
اپنے من میں پریت

حفیظ کے معروف گیت ''اندھی جوانی'' کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پرشور
گھٹائیں
چھائیں ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

اردو شعروادب سے کس حد تک اصلاح کا کام لیا جاسکتا ہے؟ یہ سوال ہر عہد میں اُٹھتا رہا ہے اور ہر عہد کی ضروریات ومعمولات کے مطابق اس کا جواب بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اس ضمن میں ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے معروف نعرے ونظریات بھی قابلِ توجہ رہے ہیں تاہم اس مضمون میں ان پر بحث نامناسب ہے۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے ادب برائے زندگی کے نظریے کو اہمیت دی اور خاص طور پر حالی نے تو بے مقصدی شعروادب کو قابلِ تحقیر قرار دے دیا تھا۔ تاہم آئندہ آنے والے ناقدین نے حالی کے اس افادی نظریے کو بھی غلط ثابت کردیا ہے۔ بلاشبہ ہر تخلیق کے وجود میں آنے کا کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے لیکن اگر مقصدیت کا غلبہ اس قدر ہوجائے کہ ادب کی بنیادی روح ہی غائب ہوجائے تو یہ عمل اور طرزِ احساس لائقِ تحسین نہیں۔ اس کے برعکس اگر تخلیق میں صرف ادبیت موجزن دکھائی دے مگر تخلیق کا اصل مقصد ہی غائب ہوجائے تو یہ طریقہ بھی تسلی بخش نہیں۔ سب سے مستحسن طریقہ یہ ہے کہ ادبیت اور مقصدیت اس طرح شاعری میں جلوہ گر ہوں کہ دونوں ایک ہی محسوس ہونے لگیں۔ حفیظ رومانوی اندازِ فکر کے حامل شاعر قرار دیے جاتے ہیں مگر یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے ایک خاص مقصد اور پیغام بھی پیش کیا ہے گیت سے زیادہ نازک اور معصوم صنف اردو شاعری میں کوئی نہیں اور ایسی اصناف بلاشبہ مقصدیت کا بار اُٹھانے کا

متحمل نہیں ہوسکتی ہیں، مگر مقام تعجب ہے کہ حفیظ نے اپنے گیتوں میں بھی نہایت معصومانہ اور بھولے بھالے انداز میں ایک پیغام پیش کردیا ہے۔ یہ پیغام محبت، پریت، دوستی، بھائی چارہ اور باہمی امن وسلامتی کا پیغام ہے:

''دل ہے پرائے بس میں'' نامی گیت کا پیغام دیکھیے:

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں

پورب میں جاگا ہے سویرا دور ہوا دنیا کا اندھیرا
لیکن گھر تاریک ہے میرا
پچھم میں جاگی ہیں گھٹائیں پھرتی ہیں سرمست ہوائیں
جاگ اُٹھو مے خانے والو پینے اور پلانے والو
زہر ملاؤ رس میں
دل ہے پرائے بس میں

.....

''پریت کا گیت'' نامی گیت میں پیغام ملاحظہ فرمایئے:

نفرت اک آزار ہے پیارے دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آ جا اپنے روپ میں آ جا تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسالے
من میں پریت

.....

حفیظ جالندھری کی گیت نگاری کا ایک اور خاص وصف ان کے گیتوں میں ''موضوعات کا تنوع'' ہے۔ حفیظ نے اردو اور ہندی گیتوں کے مروجہ موضوعات کو نہ صرف اپنی شاعری میں جگہ دی ہے بلکہ نئے نئے موضوعات کو بھی اپنے گیتوں میں سمونے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں اگر ان کے ان گیتوں کو بھی شامل کرلیا جائے جو خالصتاً بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں تو موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے حفیظ پر نظیر اکبرآبادی کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ انہی متنوع موضوعات کے پیشِ نظر حفیظ بھی عظمت اللہ خاں اور

میراجی کی طرح معتبر اور اہم گیت نگار بن جاتے ہیں۔ حفیظ نے صرف ہجر و فراق کے پیش پا افتادہ موضوعات ہی کو اپنے گیتوں میں پیش نہیں کیا بلکہ انسانی معاملاتِ زندگی کے مختلف موضوعات کو کسی نہ کسی انداز میں اپنے گیتوں میں جگہ دی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اس قدر غیر یقینی اور معمولی موضوعات کو بھی اپنے گیتوں میں پیش کر دیتے ہیں جو شاعری میں عموماً پیش کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھے جاتے، اس لحاظ سے کوئی دوسرا گیت نگار حفیظ جالندھری کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

''کرشن بنسری'' نامی گیت کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے:

بنسری بجائے جا
کاہن مرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے
گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
سنائے جا سنائے جا

.....

''اندھی جوانی'' نامی گیت میں موضوع کی انفرادیت ملاحظہ فرمایئے:

گلشن کی گل پوش ادائیں آموں کی خاموش فضائیں
کوئل کی مدہوش صدائیں
بن میں بول رہے ہیں مور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

.....

''پرانی بسنت'' نامی گیت میں موضوع کا تنوّع دیکھیے:

عمر گھٹ گئی تو کیا؟ ڈور کٹ گئی تو کیا؟
یہ ہوائے تند و تیز رُخ پلٹ گئی تو کیا؟
آ گئی بسنت رُت
اور اک پتنگ دے

.....

رنگ دے۔ رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے۔ رنگ دے قدیم رنگ

حفیظ جالندھری کے گیتوں کا یہ تنوع ان کے رنگارنگ مزاج کا پتا دیتا ہے۔

اصل میں ان کی زندگی کے مختلف تجربات گیتوں کی شکل میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے گیتوں میں بقول ڈاکٹر عنوان چشتی عورت کے دل کی دھڑکن کا سوز و گداز بھی ہے اور کرشن بھگتی، وطن پرستی اور مناظرِ فطرت کا رنگ روپ بھی اور یہ سب چیزیں مل جل کر ان کے گیتوں میں انفرادیت اور تنوع پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ یہ اقدام شعوری ہو یا لاشعوری مگر ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حفیظ جالندھری کے ہاں بہرحال گیت کو ایک وسیع تر کینوس پر پھیلانے کا اقدام ملتا ہے لیکن اس اقدام میں حفیظ یہ احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ گیت کا اصل مزاج کسی بھی سطح پر مجروح نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں ''کابل کا گیت'' میں سے ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

جب صبح کی ضیا میں ملتی نہیں مسرت
پھر شام کی ردا میں حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت
دل کو ذرا سنبھالوں پھولوں پہ آنکھ ڈالوں
دل ہے مرا افسردہ
شاید ہوں وہ بھی مردہ
شاید وہ میرے پیارے مر چکے ہوں سارے

حفیظ جالندھری نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ موسیقی کے فن کو سمجھنے میں گزارا اور فنِ موسیقی کا ذوق وشوق ان کے شاعرانہ اظہار کے لیے مفید و معاون ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے ان کے فن کی تشکیل و تکمیل میں موسیقیت کا جو عمل دخل دکھائی دیتا ہے وہ ان کی موسیقی سے والہانہ دل بستگی اور شیفتگی کا نتیجہ ہے اور ظاہر ہے کہ شعر و موسیقی کا آمیزہ تیار کرنا ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں۔ بقول حفیظ:

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

حفیظ جالندھری کے گیتوں میں موسیقی بھی ایک خاص طربیہ اور نشاطیہ رجحان لے کر آتی ہے وہ موسیقی کے لوازمات میں اضافے کے لیے ان مترنم بحور کا انتخاب کرتے ہیں جو رواں اور سبک ہوتی ہیں۔ وہ گیتوں کے لیے غنائی الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور انھیں احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ لفظ و خیال کی یہ یگانگت موسیقی کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حفیظ کے تمام گیتوں میں

صوتی، صوری اور معنوی ہر اعتبار سے موسیقیت اور غنائیت موجزن دیکھی جاسکتی ہے۔ ذیل کے گیتوں کو دیکھیے کہ حفیظ نے کس طرح موسیقی پیدا کرنے کے لیے تمام حربوں کو استعمال کیا ہے۔ کہیں انھوں نے مصرعوں کی تعداد گھٹا بڑھا کر موسیقی پیدا کی ہے اور کہیں تکرارِ لفظی سے موسیقی کے عناصر پیدا کیے ہیں۔ بہرحال یہ لفظی اور معنوی ہیر پھیر بھی وہی شاعر کرسکتا ہے جس کو اپنے خیال و اسلوب کی پیش کش پر مکمل دسترس ہو۔

''برسات'' نامی گیت میں موسیقیت کے جلوے دیکھیے:

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے
سیمیں تنوں نے
برق افگنوں نے
گیت ان کے پیارے میٹھے، رسیلے
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں

.....

گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا خود منھ چڑانا
پھر جھینپ جانا
الہڑ پنے سے
آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

.....

''بسنتی ترانہ'' کے عنوان سے پیش کردہ گیت میں موسیقیت ملاحظہ فرمائیں:

لو پھر بسنت آئی پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لبِ آب گنگ
بجے جل ترنگ
من پر اُمنگ چھائی پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

''اندھی جوانی'' نامی گیت میں شعروموسیقی کا حسین امتزاج ملاحظہ فرمائیں:

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پُرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائیں ہیں گھنگھور

گیت نگاری کے بارے میں عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد مقامی عناصر پر رکھی جاتی ہے اور اس میں زبان خاص طور پر ہندی بول چال کے قریب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اداسی اور ملال کی ایک فضا پورے منظر پر محیط ہوتی ہے۔ حفیظ جالندھری نے ان نظریات وخیالات سے اختلاف کیا اور اپنے معروف گیتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ گیت کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جو کسی بھی اصول اور قاعدے کے تابع نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں مقامی عناصر کے ساتھ ساتھ بیرونی عناصر کو بھی بڑی فن کاری اور چابک دستی سے جگہ دی ہے۔ انھوں نے گیت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ایسے مقرّس اور معرّب الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو ہماری طبع پر گراں نہیں گزرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے گیت کو حزن وملال کی بندھی ہوئی زنجیروں سے بھی رہائی دلائی ہے اور خاص طور پر طربیاتی عناصر کو گیتوں میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حفیظ نے اپنے گیتوں کے ذریعے سے ہیئت کے بھی بے شمار تجربے کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے گیت نگاری کی فطری، تاریخی اور شعری سطح کو بھی بلند کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ بہرحال اسلوب کی سطح پر بھی حفیظ نے گیت نگاری میں وہ کچھ کر دکھایا جو دوسرے شعرا غزل اور نظم میں بھی نہ کر سکے۔ ''اُلفت کا اظہار'' نامی گیت ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کس طرح حفیظ جالندھری نے اردو گیت میں اسلوب اور مواد دونوں صورتوں میں ندرتیں پیدا کی ہیں:

•
میرے دل کا باغ
پیاری، میرے دل کا باغ
میں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی
نازک نازک پھول ہیں جیسے اجلے اور بے داغ
ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ
پیاری، میرے دل کا باغ

میں ہوں دل کے باغ کا مالی لایا ہوں پھولوں کی ڈالی
اُلفت کا احساس
پیاری، اُلفت کا احساس
اُلفت ہے پھولوں کا گہنا خوشبوؤں میں رہنا سہنا
مدھم مدھم، بھینی بھینی ان پھولوں کی باس
میٹھا میٹھ درد ہو جیسے اُلفت کا احساس
پیاری، الفت کا احساس
اُلفت ہے پھولوں کا گہنا خوشبوؤں میں رہنا سہنا
اُلفت کا اظہار
پیاری، اُلفت کا اظہار
میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں تیری یہ حیران نگاہیں
ان پھولوں کی ہر ڈالی ہے اک گلشن بے خار
ان پھولوں کی رنگت جیسے الفت کا اظہار
پیاری اُلفت کا اظہار
میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں تیری یہ حیران نگاہیں

.....

حفیظ جالندھری کا گیت سے تعلق نہایت دیرینہ تھا اور آخری عمر تک انھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے گیت کے مبادیات و مقتضیات کو سمجھا اور اردو گیت میں معنویت پیدا کی۔ حفیظ نے مروج انداز سے جان چھڑائی اور لفظ اور معنی دونوں سطحوں پر گیت نگاری میں جدت پیدا کی۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے بھی حفیظ جالندھری کے گیتوں میں موجود نغمگی، جدت طرازی اور قوتِ اختراع کی داد دی ہے۔ اب ذیل میں حفیظ کے معروف گیت ''اندھی جوانی'' کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے کہ میری باتوں کی تصدیق کے لیے یہی کافی ہے:

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان
محبت پیاری پیاری
میٹھی سی بیماری
بے چاری

انجان

محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

اک کشتی ملاح سے خالی میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی

اس کشتی کا اللہ والی

لے چل لے چل اے طوفان

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

حفیظ جالندھری کے اس دعوے کے باوجود کہ:

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے

یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

ناقدین نے ان کی گیت نگاری پر چند اعتراضات کیے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ حفیظ جالندھری کے گیتوں پر سب سے بڑا اعتراض کلیم الدین احمد نے یہ کیا ہے کہ ان کے گیتوں سے تہذیب یافتہ دماغ کو سرور حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے جذبات اور خیالات کی سطح بہت نیچی ہوتی ہے۔ یہ اعتراض اس لیے غیر وقیع ہے کہ گیتوں میں خیالات نہیں بلکہ جذبات و احساسات شاعر کے پیشِ نگاہ ہوتے ہیں۔ یہ صنف عمیق خیالات کا بار اُٹھانے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ حفیظ ''تہذیب یافتہ'' دماغ رکھنے والوں کے لیے گیت نہیں لکھا کرتے تھے کیوں کہ ان کے مخاطب و قارئین عوام الناس تھے۔ اس کی وجہ بیگم بسم اللہ نیاز نے یہ بتائی ہے کہ وہ گیت کی صنف کو زیادہ مقبول عام بنانے کے متمنی تھے۔ اب ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تہذیب یافتہ دماغ کو مسرور کرنا مشکل تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے حفیظ کے گیتوں میں درد و الم کی کمی کا احساس دلاتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ وہ ''نغمۂ درد'' کے شاعر نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حفیظ کے ہاں درد و الم سے معمور نغمے بھی موجود ہیں ''اور کا ہل کا گیت'' اس کی مثال ہے تاہم وہ گیت کے روایتی مزاج کو تبدیل کر رہے تھے اور طربیہ عناصر کو اپنے گیتوں میں نمایاں جگہ دے رہے تھے۔ خود ڈاکٹر صاحب ہی نے اسی سبب سے حفیظ کو ''نغمۂ رباب'' کا شاعر قرار دیا ہے۔ حفیظ جالندھری پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کے گیت ہندی الفاظ اور لے سے تہی ہے۔ ہماری دانست میں ہندی کی مدد کے بغیر اردو میں گیت پن پیدا کر دینا خود اپنے طور پر ایک کارنامہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ اس انحراف کو عصری ضرورت بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابتدا میں اردو گیتوں میں ہندی انداز کو داخل کرنا عصری ضرورت تھی اور شعرا نے ایسا صرف عہد کی ضرورت کے مطابق کیا۔ اب وقت، مزاج اور شاعرانہ ضرورتوں میں تبدیلیاں آ گئی ہیں لہٰذا اپنے عہد اور شعری مزاج کے مطابق حفیظ جالندھری کا ہندی انداز سے انحراف ایک طرح سے حقیقت پسندانہ روّیہ ہے۔ آیئے ہم آپ مل جل کر یہ اعتراضات حفیظ

جالندھری تک پہنچائیں وہ ان اعتراضات کو سننے کے بعد یقیناً سر جھٹک کر یہی جواب دیں گے:

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

اردو گیت کی تاریخ میں حفیظ جالندھری کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے موضوع اور اسلوب ہر دو اعتبار سے اردو گیت نگاری کی روایت کو مالا مال کیا۔ اُنھوں نے فرسودہ روایات کی بیخ کنی بھی کی جن کے مطابق گیت فقط عورتوں کی المناک چیخوں کا نام تھا۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حفیظ نے گیت نگاری کے موضوعاتی امکانات کو وسیع تر کر دیا ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں نہ تو موضوع اتنا خشک ہوتا ہے کہ بوجھل محسوس ہونے لگے اور نہ اسلوب اتنا منفرد ہوتا ہے کہ مضحکہ خیز بن کر رہ جائے۔ وہ موضوع اور اسلوب دونوں کو اس انداز سے لے کر چلتے ہیں کہ افسردگی اور تنہائی میں بھی ایک خاص انداز کی نغمگی اور دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حفیظ کا کارنامہ ہے اور یہی ان کا خاص وصف۔ اب چلتے چلتے حفیظ کی زبان سے بھی سن لیجیے کہ ان کی گیت نگاری کیا ہے؟

دیکھ اس دنیا کا نظارہ
ہلکا ہلکا، پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں رنگین نغمہ زاروں میں
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری ہستی
ساری ہستی گیت ہیں میرے نیند ہے میری بستی
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت

☆☆☆

ناصر شمسی ☆

ابنِ انشا کی یاد میں

ہر عہد کے تخلیقی و ادبی منظر نامے میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو یاد رہ جاتی ہیں اور کچھ تخلیقی کام بھی ایسے ہوتے ہیں جن کی اہمیت تادیر قائم رہتی ہے۔ جب کہ دنیا کی کسی بھی ادبی تاریخ میں بیشتر ادیب شاعر زندہ نہیں رہتے مگر ان میں سے جو زندگی کے بکھرے ہوئے مواد میں سے بہتر چیزوں کا انتخاب کرنے کی سعی کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے نام ہمیں یاد رہ جاتے ہیں اور ان کی ادبی کاوشیں آنے والی نسلوں کے لیے ادبی سرمایہ بنتی ہیں۔ تخلیق کاروں میں ہمیں دو طرح کے لوگ عمومی طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جن کو ابتدا میں ہی شہرت نصیب ہو جاتی ہے جب کہ دوسری صف میں وہ ہوتے ہیں، جو شہرت اور توقیر جن کی ہستی کے اُور پڑاؤ ڈالے رکھتے ہیں اور یہ ہی زندہ ادیب ہوتے ہیں۔

گزشتہ ایک سو آٹھ سال کے عرصے میں ادب کے جتنے بھی نوبل پرائز دیے گئے ہیں ایسی تخلیقات کے اہم ترین اوصاف جرأت اظہار اور تازگی قرار دیے گئے ہیں۔ تازگی سے مراد یہ کہ تخلیق میں توانائی ہو، عصری تقاضوں پر پورا اُترتی ہو اور یہ کہ اپنے عہد کے مسائل سے ہم آہنگ ہو۔ مثال کے طور پر موپاساں اور چیخوف جیسے ادیبوں کے یہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ یہاں کسی قسم کا تقابلی جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ ابن انشاء کے یہاں بھی روزمرّہ کی زندگی ہی نظر آتی ہے۔ لنگڑی لولی، بے ضمیری اور جہالت سے عبارت زندگی ہو یا پھر نئے سانچوں میں ڈھلنے والی تلملانے والی زندگی، ایک متحرک اور جہد سے پُر زندگی ہمیشہ ابن انشاء کے قلم کے حصار میں رہی ہے۔ ان کے تخلیقی شعور کے موضوع خالص انسان اور اس زمین پر رائج ہونے والی زندگی سے متعلق ہیں۔ اسی لیے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی تفہیم اور زندگی سے جڑی مقصدیت ہی شاید اُن کا ادبی نظریہ بھی رہا ہو۔

خیال کیا جاسکتا ہے کہ انشاء جی زندگی کو شاید بہت ہی قریب سے دیکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے اسی لیے ان کے یہاں نہ کوئی رومانوی دھند ہے اور نہ ہی کوئی نظریاتی ہٹ دھرمی، بلکہ ان کی تخلیقات فکری ہمہ گیریت کے ساتھ لطیف اور شفاف احساسِ انسانی کو چھو

☆A-237، بلاک 15، گلستانِ جوہر، کراچی

لیتی ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ قلم کار نہ تاریخ نویس ہوتا ہے اور نہ ہی مستقبلیات کا کوئی ماہر، ہاں اگر اس نے اپنی تخلیق میں تاریخ کو ایک حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے یا یہ کہ اُس کا وژن آنے والے وقتوں کے لیے اپنی معنویت میں ایک پیش بینی رکھتا ہو تو ان حوالوں سے وہ ایک خاص مقام کا حامل ہوگا۔ اسی مخصوص سیاق وسباق میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن انشاء کی تخلیقات کا مطالعہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

حب الوطنی ہو، تمدن کا معاملہ ہو یا انسان کی جدوجہد کی تصویر کشی، جب اور جیسا معاشرتی توازن انشاء نے دیکھا اور محسوس کیا انسانی احساسات اور رشتوں کے حوالے کر دیا۔ ان کے یہاں سماجی و سیاسی ضمن میں زندگی کا بھرپور ادراک موجود ہے۔ حسن بیان اور پڑھنے والے کے لیے کشش کے ساتھ ساتھ ادب کی اعلیٰ قدریں اور زندگی کی عکاسی، تشریح اور تعبیر ان کی تخلیقات میں رواں نظر آتی ہیں۔

ابن انشاء کی شعری تخلیقات میں اگر زندگی کی کسمپرسی اور بے بسی کی عکاسی ہوئی ہے تو نثر میں شگفتہ اور مچلتی اٹھلاتی زندگی بہتی نظر آتی ہے۔ سفرنامے ہوں، مکتوبات ہوں یا کالم نگاری، طنز و مزاح کے اثر انگیز انداز ان کے یہاں بڑے چاق و چوبند دکھائی دیتے ہیں۔ ابن انشاء کے اندر حقیقتاً ایک ہنستا مسکراتا ایسا انسان موجود تھا جو دوسروں کو بھی ہنستا مسکراتا دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ عہدِ یوسفی کے فرمانروا مشتاق یوسفی ابن انشاء کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''یہ ان کے مزاج کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ انھوں نے آلامِ سیاست کو بھی سادہ دل بندوں کے لیے آسان بنا دیا۔''

آپ بھی ملاحظہ کیجیے، ''اردو کی آخری کتاب'' میں پاکستان کے جغرافیہ کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔''

ابن انشاء ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے یا اقوام متحدہ کے ادارے سے نگری نگری گھومے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں رہے یا آوارہ گرد کی ڈائری تحریر کی، چین چلنے کی دعوت دی، اردو کی آخری کتاب لکھی یا خمارِ گندم سے لطف اندوز کیا، یہ بات بہرحال سامنے آتی ہے کہ انھوں نے جمالیاتی قدر سے سماجی قدر کی جانب سفر کیا، ان کی تحریروں کے سماجی اور سیاسی رجحان کے پس منظر میں سوسائٹی میں پائے جانے والے کرداروں کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ ایک قابل قدر اور دلچسپ معرکہ ہے۔ اُن کی نثر میں خوبصورتی، خارجیت، سادگی اور کردار نگاری کے تیکھے پن سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ قاری کے لیے زبردست Readability کا باعث بنتا ہے۔ جب کہ ان کی شعری تصنیفات مثلاً چاند نگر اور دل وحشی تو ہماری اردو شاعری کی مانند دکھ اور غم سے ہی عبارت ہیں اور ہمارے معاشرے میں زندہ رہ جانے والے فرد کا المیہ بھی!

کیا یہاں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ابن انشاء جیسے ادیب پر بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ جب کہ ان کی ہمہ جہت تخلیقی کاوشیں اور

پُرکشش انسان دوست شخصیت اردو ادب کے فروغ اور پھیلاؤ میں کس قدر معاون اور اثر انگیزی کی حامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی جیسا بڑا ادیب ان کا جامع تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے:

''شیر محمد قیصر کے پردے میں ایک خوبصورت شاعر، ایک بے مثل مزاح نویس، ایک زندہ دل سفرنامہ نگار، ایک محتاط مترجم، بچوں کا ایک محبوب شاعر، ایک بے بدل مکتوب نگار، ایک وضع دار دوست اور ایک بے لوث انسان بولتا نظر آتا ہے۔''

اس تناظر میں آپ بتایئے کیا انشاء جی کو ہم نے ایک طرف اٹھا کے نہیں رکھ دیا ہے۔

آج بھی ادیب یا تخلیق کار ابن انشاء کی طرح سوسائٹی کے لیے ایک فرحت، تازگی اور شعوری احساس کے لیے سعی کرسکتا ہے اور زندگی کی تفہیم اور زندگی میں سکھ اور امید مہیا کرنے کا جواز بن سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کے قلم کار کا فریضہ نئے انسان کی فلسفیانہ اور حقیقی نمائندگی کرنا ہے۔ یہ نیا انسان وہ ہے جو اس Virtual Reality کے زمانے میں ہمارے اور آپ کے درمیان جنم لے رہا ہے جو نئی زندگی اور نئی زمینوں سے رابطے جوڑنا چاہتا ہے اور وہ دکھ اور سکھ بانٹنے رکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس نئے انسان کی حقیقی نمائندگی کے ذریعے ہی ہم مشاہدے اور ہمہ گیر فکر کے امتزاج سے جہانِ تازہ کی نمود دیکھ پائیں گے۔

[یہ مضمون انجمنِ ترقیِ اردو کے زیرِ اہتمام ابن انشاء پر منعقد کردہ تقریب میں ۲۶ فروری ۲۰۰۹ء کو پڑھا گیا۔]

جدید اردو افسانے کے رجحانات

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

قیمت: ۳۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

سلیم صدیقی☆

یوٹوپیا کی کہانی

اکثر ہم عینیت پسند ہی نہیں بلکہ ادب وفن میں مقصدیت پر ایمان رکھنے والے بہت سے نامور شعرا و ادیبوں سے بھی سنتے ہیں کہ شاعر یا ادیب کا یہ کام نہیں کہ وہ دنیا اور سماج کے مسائل کی نشاندہی کے علاوہ ان کے حل کرنے کے طریقوں اور راستوں سے بھی لوگوں کو آگاہ کرے۔ اُن کے خیال میں یہ کام سیاستدانوں اور سماجی سائنس دانوں کا ہے کہ وہ عملاً ان مسائل کو حل کرنے کی تدابیر وضع کریں۔ البتہ شاعر، ادیب اور فنکار کا کام اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک بہترین معاشرے اور مثالی دنیا کا تصور پیش کرنا ہے، جو وہ صدیوں سے کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ مقتدر شاعر منیر نیازی مرحوم نے ایک اخباری انٹرویو میں بہت ہی پیارے انداز میں کہا ہے کہ ایک شاعر جب کسی خوبصورت پھول کا امیج بناتا ہے تو دراصل وہ ایک پھول کا امیج نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک بہت ہی حسین اور مثالی دنیا کا امیج ہوتا ہے، جس کو اس شاعر نے بنی نوع انسان کے لیے اپنے تصور میں تراشا ہے۔ سکّہ بند معروضیت پسند حضرات تخلیقات میں محض خیالی دنیا اور مثالی معاشرہ تراشنے کو صرف رومانی تصور قرار دیتے ہیں، جس کا زمینی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ کم از کم آج تک کی انسانی تاریخ سے تو ظاہر بھی ہوتا ہے کہ کسی بھی شاعرانہ اور تصورانہ جنت کا روئے زمین پر نزول، اور وہ بھی سوچنے والے کہ خوابوں کے عین مطابق، تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صدیوں سے اس خیالی اور مثالی جہت کا خواب دیکھنے اور اس کی تعمیر کے لیے عملاً کوشش کرنے والوں میں محض پاگل، دیوانے ہی نہیں، بلکہ ایک سے ایک جید فلاسفر، نامور سیاستدان، انسانیت کا درد رکھنے والے شہرہ آفاق شاعر اور ادیب بھی شامل رہے ہیں۔ چناں چہ اس مثالی دنیا یا یوٹوپیا کے تصور اور اس کے نفاذ کی عملی کوششوں کی دلچسپ تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

''یوٹوپیا'' (Utopia) کی اصطلاح کا ماخذ دراصل ایک یونانی لفظ ہے، جس کے معنی ''کہیں نہیں'' کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اس اصطلاح کو سر تھامس مور (Sir Thomas More) (۱۴۷۸_۱۵۳۵) نے ۱۵۱۶ء میں استعمال کیا، تھامس مور ایک کیتھولک

☆5C-10/5، ناظم آباد، کراچی

مبلغ اور دانشور تھا، جس نے بادشاہ ہینری ہشتم کو چرچ آف انگلینڈ کے سربراہ کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس پاداش میں اس کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔ صدیوں بعد ۱۹۳۵ء میں اس کو Saint کا درجہ دے دیا گیا اور اس طرح کیتھولک عیسائیوں میں وہ شہید سینٹ کی مقدس ہستی کے طور پر جانا جانے لگا۔ لیکن ادبی دنیا میں اس کی لازوال شہرت مندرجہ بالا تصنیف یعنی Utopia کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک پُرامن، خوش حال اور بلاتفریق و تخصیص تمام انسانوں کے لیے مثالی دنیا تھی۔

پہلا نام اس سلسلے میں جو آتا ہے وہ افلاطون (Plato) کا ہے۔ یہ یونانی فلاسفر سقراط کا شاگرد، لیکن ارسطو کا استاد تھا۔ اس کی عظیم تصنیف "Dialogues" ہے، جو اس کے استاد کے افکار پر مبنی ہے۔ لیکن اس کی اپنی تصنیف ''جمہوریہ'' (Republic) بھی اس کے ایک طویل حصے کی صورت میں موجود ہے۔ اس تصنیف کے مطابق افلاطون کا نظریہ یہ تھا کہ کیوں کہ ہر آدمی صلاحیتوں کے اعتبار سے دوسرے سے جدا ہوتا ہے، لہٰذا ایک تخیلی معاشرے میں انسانوں کو اُن کی انفرادی صلاحیتوں کی روشنی میں مختلف طبقوں میں رکھا جائے۔ وہ تعلیم کو بنیاد بناتے ہوئے معاشرے کو اس طرح افراد فراہم کرتا ہے۔ (۱) اٹھارہ سال کی عمر تک لڑکے کو جمناسٹک اور کھیلوں، موسیقی، پڑھنے لکھنے کی تعلیم دینے کے علاوہ ادب سے بھی روشناس کرانا۔ اگر لڑکا اس کورس کو پاس کر لیتا ہے تو وہ اگلے اسٹیج پر ترقی کا حق دار ہوگا۔ ناکامی کی صورت میں وہ تجارت کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔ (۲) ۱۸ سے ۲۰ سال تک کی عمر تک اُن لڑکوں کے لیے جنھوں نے پہلا کورس پاس کر لیا ہے، ان کو دو سال کا کیڈٹ کورس مکمل کرنا ہوگا۔ ناکامی کی صورت میں وہ فوج میں سپاہی بن سکتا ہے جب کہ کامیابی کی صورت میں اس کو سماجی رہنما بننے کی تربیت دی جائے گی۔ اس سلسلے میں اسے فلسفہ، علم الحساب، سائنس اور فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری حکومت پر ہوگی، جو اس کو اپنی صلاحیتوں کی روشنی میں مناسب عہدے سنبھالنے کی بھی تربیت دے گی۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو نے آگے چل کر یہ بھی تجویز پیش کی کہ حکومت کو بچے کی پیدائش کے وقت ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اگر بچہ تندرست ہے تو اسے زندہ رہنے دیا جائے اور جسمانی اور ذہنی نقائص کی صورت میں اسے اس حق سے محروم کر دیا جائے۔

افلاطون کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے یونانیوں کے عہدِ زریں کے علاوہ رومن عہد میں بھی فلاسفروں، ادیب و شاعروں اور فنکاروں نے کسی نہ کسی طور پر مثالی سرزمین کے تصور کی بازگشت کو قائم رکھا اور اپنے فن و تحریر کے ذریعے اس کی عکاسی کی کوشش کی۔ بلکہ شاعروں ا، فلاسفروں سے کہیں پہلے، خود عوام نے اپنے سیدھے سادے یوٹوپیا تخلیق کیے۔ انگریزی کی شاعری میں The Land of Cokaygne میں نہروں سے دودھ اُبلا پڑتا ہے، کچھ نہروں سے شراب اُمڈی چلی آتی ہے۔ یہ جنت ہیروں اور جواہرات کے ستونوں پر قائم ہے۔ چرچ کے کمرے اور ہال کیک سے تیار ہوئے ہیں، جب کہ اس کے کلس لذیز پڈنگ سے۔ یہاں تیل، دودھ، شہد اور شراب کی فراوانی ہے۔ تازہ تازہ بھنی ہوئی مرغابیاں فضا میں بے چینی سے اُڑ رہی ہیں، اس انتظار میں کہ کوئی انھیں فوری طور پر لقمہ بنائے۔ Cokaygne ایسی سلطنت ہے جہاں نہ صرف انواع و اقسام کے کھانوں اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کثرت و فراوانی

ہے، بلکہ خصوصی بات یہ ہے کہ انھیں بغیر کسی محنت و مشقت کے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہاں اس کوفوک نظم سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے دورِ غلامی کے ابتدا کی منزلوں سے گزرنے کے بعد کم از کم انگلینڈ کے نچلے اور غربت و افلاس کی چکی میں پسنے والے عوام طبقاتی شعور حاصل کر کے اپنے مستقبل کے لیے امید کی کرن دیکھنے لگے تھے۔ چناں چہ اس کے اس یوٹوپیا میں ''کھاؤ پیو عیش کرو'' کے مصداق سامانِ نادونوش کی فراہمی کے علاوہ امن و آشتی اور سماجی انصاف کے اعلیٰ معیار بھی تصور کے طور پر ملتے ہیں۔ اس نظم کی یوٹوپیا میں دن کبھی غروب نہیں ہوتا ہے۔ کسی جھگڑے فساد کا تصور یہاں محال ہے، موت کا وجود نہیں، لازوال زندگی ہی زندگی ہے، جوان، بوڑھے، طاقتور اور کمزور کی کوئی تخصیص نہیں، سب برابر ہیں۔ امیروں کا اس سلطنت میں قطعی داخلہ بند ہے، کنگال اور مفلس بھی کم از کم سات سال جانوروں کی سی زندگی گزارنے کے بعد اس یوٹوپیا میں جانے کے اہل ہو سکتے ہیں۔

تھامس مور کے دور تک آتے آتے خیالی اور مثالی عافیت گاہ کے خطوط باقاعدہ اور کسی نہ کسی استدلال کے ساتھ منظم ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جس وقت اس نے یوٹوپیا کی اصطلاح وضع کی اور اس کے نام پر اپنا ناول تخلیق کیا، اس وقت تک انگلینڈ میں اون کی تجارت میں انقلابی اضافہ ہوا تھا۔ سینکڑوں کھیت اس کے نتیجے میں چراگاہوں میں تبدیل ہو گئے۔ زراعت سے وابستہ افراد میں بے روزگار کا دور دورہ تھا اور معاشی پریشانیوں نے جرائم اور دوسری اخلاقی برائیوں میں خوفناک اضافہ کر دیا تھا۔ ان حالات میں حساس مفکر تھامس مور نے معاشی اور معاشرتی بحران کا حل یہ پیش کیا کہ قرونِ وسطیٰ میں رائج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی امداد باہمی کے اصولوں پر کاربند برادریوں کا نظام واپس لایا جائے۔ سر تھامس مور کی یوٹوپیا موجودہ ملک ایران میں پہاڑوں کے درمیان کہیں واقع ہے۔ یہاں نجی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ محنت کش کو معاشرے میں تندہی سے کام کرنے کے عوض محنت کے عین مطابق معاوضے کی ضمانت تھی۔ محنت کے اوقات چھ گھنٹے تک محدود تھے، سب کے لیے مفت تعلیمی اور طبی سہولتیں حاصل تھی، مذہبی آزادی تھی، عورت مرد برابر تھے، جرائم سے نمٹنے کے لیے طاقت اور سزا کی بجائے اصلاح اور سرزنش پر زیادہ زور تھا۔ حکومت کا ڈھانچہ سیدھا سادھا اور جمہوری تھا۔ منتخب اہل کاروں کے اختیارات محدود تھے، حکومت کی آمدنی اور اخراجات پر کڑی نظر رکھی جاسکتی تھی۔ سر تھامس مور کے ان خیالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ اپنے عہد سے صدیوں آگے تھا اور اس کی تصنیف Utopia نے افلاطون کی تصنیف جمہوریہ (Republic) کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

تھامس مور کے بعد جن لوگوں نے یوٹوپیاؤں کی تشکیل میں تحریری یا عملی طور پر حصہ لیا، ان میں مندرجہ ذیل نام سرفہرست ہیں:

۱۔ فرانس بیکن (Fransis Beacon) اس نے سترہویں صدی میں Atlantis نامی کتاب لکھی، جس کو اب بھی فنی اور لسانی خوبیوں پر کلاسیکی درجہ حاصل ہے لیکن اس کی اپنی یوٹوپیا تھامس مور کے مقابلے میں اس لحاظ سے کمتر معیار کی ہے کہ جمہور کی بجائے بادشاہ کی اس میں زیادہ اہمیت ہے اور عام رعیت اس کے خیر و خیرات کی محتاج ہے۔ لیکن اس یوٹوپیا میں علم و دانش اور

خاص کر سائنس کی بہت اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی انگلینڈ میں Royal Society جیسے علمی اور سائنسی ادارے وجود میں آئے۔

۲۔ جیمز ہیرنگٹن (James Harington) ہیرنگٹن کی تصنیف "The Commonwealth of Ocean" (مولفہ ۱۶۵۶ء) اپنے وقت میں ناقدری کا شکار ہوئی۔ لیکن جمہوریت اور خاص کر پارلیمانی نظام پر قائم آج کی تمام سوسائٹیوں اور حکومتوں کے لیے یہ تصنیف نہایت انقلابی ثابت ہوئی، کیوں کہ بیلٹ کے ذریعے انتخاب، دو ایوانوں پر مشتمل مقننہ اور منتظمہ کے اختیارات میں دوری اور فرق اور دیگر دوسرے خطوط اور ضابطے ہیرنگٹن نے پہلی بار اپنی یوٹوپیا کے لیے وضع کیے، جو آج کی کسی بھی جمہوری ریاست کے لیے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ سینٹ سائمن (Saint Simon) اس کی کتاب New Christianity (مولفہ ۱۸۲۵ء) فرانسیسی سوشلزم کا نقطۂ آغاز ہے۔ سوشلزم کے دوسرے پہلوؤں کے علاوہ نجی ملکیت کو قومیانے کا تصور اس یوٹوپیا میں ہمیں جذباتیت کی بجائے علمی استدلال کی صورت میں ملتا ہے۔

۴۔ فرانسوئس چارلس فوریئر (Francois Charles Fourier) فوریئر ایک انارکسٹ تھا، لیکن اس کے یوٹوپیا چلانے کے ضابطے اور اصول سخت ترین تھے۔ شراکت کی بنیاد پر قائم اس کے Phalanxe نظام کو خاص طور پر کئی نامور امریکی دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے سراہا، یہی نہیں بلکہ اس کے نظریات پر مبنی ایک فوریئر کالونی بھی Brook Farm کے نام سے امریکہ میں تعمیر ہوئی جو چند سال بعد زبردست آتش زدگی کے نتیجے میں تباہ ہوگئی۔

۵۔ رابرٹ اوون (Robert Owen) رابرٹ اوون بھی فوریئر کی طرح ایک عملی یوٹوپیائی نظام کا بانی تھا، لیکن اس کے نظام میں انارکزم کی بجائے سوشلزم اور جمہوریت کو اہمیت حاصل تھی۔ پورا معاشرہ اس کے ہاں برادری سسٹم پر استوار تھا اور محنت کش اس کے یوٹوپیا میں ایک بنیادی کردار کا حامل تھا۔ اشتراک کی بنیاد پر قائم اس کی سوسائٹیاں انگلینڈ کے علاوہ امریکہ میں بھی قائم ہوئیں لیکن اس کی اسکاٹ لینڈ میں تعمیر کی ہوئی بستی آج تک اپنے امن وسکون، محبت و آشتی پر مبنی صنعتی ماحول نیز اپنے اعلیٰ پیداواری معیار کی وجہ سے آج تک یوٹوپیائی ادب ہی نہیں بلکہ معاشی اور سیاسی لٹریچر میں بھی ایک خوبصورت معاشرتی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ رابرٹ اوون انگلینڈ کا بڑا صنعت کار تھا، لیکن اس کی پوری زندگی غریب اور محنت کشوں کے لیے آدرشی سرزمینوں اور ان کے لیے بہتر قوانین کے حصول کی جنگ میں گزری اس کے علاوہ عالمی مزدور تحریک میں رابرٹ اوون نے جس جرأت مندانہ طور پر اپنا کردار ادا کیا، اس نے بھی اس کا نام تاریخ میں محنت کشوں کے ایک عظیم محسن کے طور پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ افسوس کے آخر میں غریبوں اور مزدوروں کا یہ غم خوار و ہمدرد بھی برطانوی سماجی اور سیاسی نظام اور روایات کے آگے بے بس ہو گیا اور اپنے سینکڑوں فیض رساں منصوبوں اور اپنی انسانیت دوستی اور آفاقیت پر مبنی یوٹوپیا کی ہمہ گیر تکمیل کے بغیر ہی مایوسی کے عالم میں اس جہاں سے

رخصت ہو گیا۔

مندرجہ بالا ناموں کے علاوہ ادب میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق یوٹوپیائیں تخلیق کرنے اور اس میں نت نئے رنگ بکھیرنے والوں میں بہت سے ادیب ایسے ہیں جن کو اب بقائے دوام حاصل ہے۔ان میں چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

سیموئیل بٹلر (Erewhon)، ڈینئیل ڈیفو (Robinson Crusoe)، جونیتھن سوئفٹ (Gulliver's Travels) ولیم مورس (News From no Where)، جیک لنڈن (The Iron Steel)، ایچ جی ویلز (The Time Machine) وغیرہ۔ ای۔ایم فوریسٹر (The Machine Stops)، آلڈس ہکسلے (Brave New World)۔

کچھ ایسی بھی تصانیف ہیں جو کسی بھی یوٹوپیا کے تصور یا اس کے عملی تجربے کے ہی یکسر خلاف ہیں اور جو شخصی آزادی کے نام پر بالواسطہ لوٹ کھسوٹ کا موجودہ نظام ہی برقرار رکھنے کا پیغام دیتی ہیں۔ان میں جارج آرویل کی مشہور عالم تصانیف "Nineteen Eighty Four" اور "Animal Farm" اور آلڈوس ہکسلے کی ناول Apes and Essence شامل ہیں۔Anti-Utopia کا کردار ادا کرنے کے باوجود اپنے ندرتِ بیان کی بنا پر ان تصانیف کو بھی یوٹوپیائی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

مختصراً یہ کہ افلاطون سے لے کر تھامس مور، بیکن، ہیرنگٹن، رابرٹ اوون، سوئفٹ، ڈیفو، ایچ جی ویلز اور دوسرے مفکروں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر یوٹوپیا پیش کیے ہیں۔انھوں نے اکثر صورتوں میں محض تصور اور خواب ہونے کے باوجود انسانی تاریخ میں سماجی، معاشی اور سیاسی شعور پیدا کیا ہے اور مثبت مذہبی اور اخلاقی اقدار اور ایک منصفانہ معاشرے کی جس طرح انھوں نے تائید و ترویج کا فریضہ انجام دیا ہے، اس نے ان کے یوٹوپیاؤں کو عالمی تاریخ اور سماجی و سیاسی کلچر کے ساتھ لازوال ادبی شاہکار کا بھی ایک لازمی جزو بنا دیا ہے۔

تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد

از

شہزاد منظر

صفحات: ۳۲۹ قیمت: ۱۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

مجید خان لودھی

اردو کی جدت طرازی اور اہمیت

جدیدیت لفظ جدید سے وجود میں آیا ہے۔ جس کے معنی فنونِ لطیفہ کی وہ نئی تکنیک اور تحریکات جو جنگِ عظیم اوّل کے بعد شروع ہوئیں۔ اسی مفہوم سے لفظ جدّت بنا۔ جس کے معنی نیاپن، تازہ کاری کے ہیں۔ جدّت کو جدیدیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا کیوں کہ اس کے معنی میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ جدیدیت اور جدّت نے ادب میں نئی بساط بچھائی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۶۶ء میں اپنی تحریر میں بتا چکے تھے کہ ''آئندہ اردو زبان وادب کی ترقی کا دارومدار انگریزی زبان وادب سے استفادے پر منحصر ہوگا۔'' ہندوستان میں انگریزوں نے انگریزی تعلیم کے ذریعے جو دروازہ کھولا۔ وہ اردو زبان وادب میں معاون ثابت ہوا۔ انگریزی ادب سے اپنے خیالات کی عمارت تعمیر کی اُس میں اپنی روایات کو نہیں چھوڑا اور اردو کے اساتذہ کے ساتھ بھی رشتہ قائم رکھا۔ ''کیوں کہ کوئی بھی پرانی شے اس وقت تک دم نہیں توڑتی جب تک کہ وہ اپنی تمام امکانی قوت کو صرف نہیں کر چکتی ہے۔'' چناں چہ عہد حاضر کے ادیبوں و شاعروں نے جدید نثر وشاعری کو جنم دیا جو اظہارِ حقیقت اور حقیقی فکر سے قریب تر، مناسب، موزوں اور قوی تھا اور آج بھی قوی ہے۔

جب معنی بدلتے ہیں تو اس کے اظہار میں تبدیلی آتی ہے اس طرح اظہار اور بیان کے نئے نئے تجربات وجود میں آتے ہیں جنھیں آپ جدت کا نام دے سکتے ہیں۔ اس طرح فنونِ لطیفہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا احساس ہمارے حواس میں موجود ہیں۔ اس طرح ادب وجود میں آتا ہے اور وہ معروضی صورتیں اختیار کرتا ہے کیوں کہ اس کی صورت وضرورت ادیب وشاعر کے حواس میں ہے۔ وہ ایک احساسِ آہنگ ہماری فطری زندگی میں ہے۔ یہی احساسِ قوت ہماری زبان اردو پر کس طرح ہماری زندگی پر اثر انداز ہورہی ہے۔ اردو زبان کا حسن آہنگ اصل میں ہماری زندگی کا زیور ہے۔ اس کے لیے یہاں اپنی زندگی کے دو تجربات تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ ایک بار مجھے بھارت جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کی بول چال کی زبان کسی قدر اردو ہے۔ جہاں رقم نے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ وہی زبان ومکان، وہی چہرے مورے، وہی رنگ روپ، وہی چال ڈھال، وہی طرز معاشرت، وہی انجمن ترقی اردو ہند میں اپنائیت کا احساس، ایسا محسوس ہورہا تھا میں اپنوں میں ہوں۔ جب کہ ۲۰۰۴ء میں کینیڈا جانے کا بھی اتفاق ہوا، جہاں راقم اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا رہا اور زبان کا عمل یا اظہارِ اجنبیت کا احساس دلاتا رہا، جب کہ ابلاغ کے لیے کہیں کہیں انگریزی زبان استعمال کرلیا کرتا تھا۔ لیکن زبان میں وہ بلاغت نہیں تھی جو میری علمیت کا گہوارہ ہے، صرف اظہار کے ذریعے ابلاغ آسان کرتا رہا۔ اظہار تو ہوگیا لیکن زبان کا فن ادھورا رہا، اس طرح میرے فن کا جوہر پورا نہ ہوسکا۔ اس کے متعلق بہت سے نظریاتی اختلافات ذات کی تغیر اور

تشریح سے تعلق رکھتے ہیں، کیوں کہ فرد کی انفرادیت اس کی اجتماعیت کی رہینِ منت ہے۔ معاشرہ میں مشترکہ خصوصیات یا مشترکہ ذہن یا سماجی شعور کی وجہ سے ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو سمجھتے ہیں، جس کی بنیاد پر ایک مجلسی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ وہ عوام کے تعاون اور شرکتِ ذہنی سے وجود میں آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کا مقصدِ حیات زبان کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان شعور کی معروضی صورت ہے اور شعور زبان کی داخلی حقیقت ہے اس لیے ایک وحدت میں ایک قومی یا ملکی زبان ہونا چاہیے۔

قومی زبان بولنے والا معاشرے کا ایک مربوط اور نمائندہ فرد ہوتا ہے۔ جو معاشرتی وجود سے ربط رکھتا ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو انسانوں کی مجلسی فطرت وجودیت سے انکار کردیتی ہے۔ اس کے سماجی تقاضوں سے انکار کردیتی ہے، اُس مشترک قدروں کے وجود سے انکار کردیتی ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ زبان کا شعور ہی اصل میں سماجی شعور ہے۔ جو ہماری زندگی کے سماجی عمل سے حاصل کیا گیا ہے ایسی صورت میں وہ معاشرہ انسانی وجود اور ایک علاقے کی زبان کی وجود کی پہچان بن جاتا ہے جو قومی زبان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی اندرونی رشتہ ذہن یا شعور کا نہیں بلکہ رابطہ اردو زبان اور سماجی رشتوں کا ہوتا ہے۔

ہم طے شدہ حقیقت کو نہیں بدل سکتے ہیں، اُس کا ذکر کرسکتے ہیں۔ طے شدہ حقیقتوں کو بدلنے کے لیے قومی اُمنگوں کو بدلنا ہوگا۔ بے حسی کی زندگی سے نکلنا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان ایک خلائی محیط میں گھرا ہوا ہے۔ اس گنبد سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی مداوا کوئی اُمید نہیں جمیل الدین عالی صاحب ایک طویل عرصے سے اردو کے نفاذ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ اِدھر ڈاکٹر سید مبین اختر نے بھی تحریک نفاذ اردو کا نعرہ لگایا ہے پاکستان کا برسراقتدار طبقہ اور بیوروکریسی خود ایک طاقت ور ادارے ہیں۔ ان دونوں کا اردو کو قومی زبان اپنانے میں ان کا منفی رویہ رہا ہے جو ہم سب پر عیاں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک ادیب یا شاعر یا فن کار جو اظہارِ خیال کی کوششوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ فنونِ لطیفہ کے ذریعے اپنا جادو جگاتے رہتے ہیں اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات میں شریک کیے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں اپنی قومی زبان کا سہارا لیتے ہیں جو خاص وعام میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ایک ادیب یا شاعر اپنے ادب پاروں یا شاعری سے اپنے لوگوں کو روشناس کراتا ہے۔ جس کا تعلق اُس کی محفل سے ہوتا ہے، اُس کا سفر اپنی منزل کی طرف ہے۔ یہی ادبی روایتیں، حقیقت نگاری کی روایتیں ہیں۔

آج کے دور میں اپنی روایت پسندی کو برقرار رکھنا ہے تو فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والا اہلِ محفل کو اپنے جذبات وخیالات سے آگاہ کرنے کے لیے مجلس سجاتا ہے۔ اپنی اور دوسروں کی پیاس بجھتا ہے اور روایت کو جلا بخشتا ہے۔ ادب وشاعری الگ زندگی کا نام ہے جو اپنی قومی زبان اردو کے ذریعے پورے معاشرے میں گھومتی ہے جہاں جہاں اس زبان کے بولنے والے اور سمجھنے والے بستے ہیں۔ اس طرح آج ہماری زبان اردو کا بہت بڑا ہے جو ادیب یا شاعر کو مطمئن کی نوید سنا رہا ہے۔ کاش اردو کا سو فی صد نفاذ ہوجائے۔

ڈاکٹر اسد فیض

ڈاکٹر مہر عبدالحق کی یاد میں

ڈاکٹر مہر عبدالحق (۱۹۱۵۔۱۹۹۵) کا شمار جنوبی پنجاب کے ان مشاہیر ادب میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ علم و ادب کے فروغ میں صرف کیا اور یادگار کتب تصنیف کیں۔ ان کا خصوصی دلچسپی کا میدان لسانیات، قرآن، اقبالؒ اور خواجہ غلام فرید کی فکر اور شاعری تھا۔ نصف صدی سے زائد پر محیط ان کی تخلیقی اور تحقیقی کاوشیں ملتان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے تقریباً پچاس کتب تحریر کیں جن کا بڑا حصہ سرائیکی ادب پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار جدید سرائیکی ادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اپنے کیریئر کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔ دوران ملازمت انھوں نے ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے اردو میں سرائیکی اور اردو کے لسانی روابط کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ وہ ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہونے تک درس و تدریس سے وابستہ رہے بعدازاں پی ایچ ڈی کے اسکالرز کی راہ نمائی کرتے اور تحقیقی و تصنیفی کاموں میں مگن رہے۔ ان سے ایک بار گفتگو کی سعادت حاصل ہوئی۔

س: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی اور اپنے اس دور کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میرا وطن لیہ ہے۔ میں وہاں یکم جون ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوا۔ میٹرک تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ جس اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس میں ہندو طلبا زیادہ تھے۔ یعنی ہندو طلبا پچاس اور مسلمان صرف سات یا آٹھ۔ اسکول میں اس دور کے تمام ادبی جرائد آتے تھے۔ جن سے ہم استفادہ کرتے تھے۔ جس نے میرے اندر ادبی ذوق بیدار کیا۔ زندگی میں اس دور میں بے پناہ مشکلات درپیش رہیں۔ غربت تھی، فاقے کرنا پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ لیہ سے مظفر گڑھ آنا تھا پیسے نہیں تھے۔ میں پیدل ہی چل پڑا اور چالیس میل پیدل چل کر مظفر گڑھ پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے میں قسمت کا قائل نہیں ہوں بلکہ محنت پر ایمان رکھتا ہوں۔ یہی میری کامیابی کی دلیل ہے۔

س: علامہ اقبال کی شاعری سے دلچسپی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج: بچپن میں میری والدہ مجھے علامہ اقبال کی نظم پرندے کی فریاد سناتی تھی۔ میں اس وقت تین یا چار سال کا تھا۔ میرے والد چھ جماعت تک پڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ والدہ کو سکھائی تھی۔ ممکن ہے یہ اس دور میں نچلی جماعتوں کے نصاب میں شامل ہو۔ اس نظم کی موسیقیت نے مجھے بچپن میں ہی اپنا اسیر کر لیا تھا اور یہ ہمیشہ میری والدہ کی نسبت سے میرے دل میں جاگزیں

رہی۔ ساتویں جماعت میں جب میں پڑھتا تھا تو میں نے علامہ اقبال کا ایک شعر رسالہ ہمایوں میں پڑھا:

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مجھے اس کا مفہوم سمجھ نہ آتا تھا کہ خدا بندے سے خود کیوں پوچھے۔ بس اس وقت میرے اندر علامہ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

س: علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: علامہ اقبال بہت بڑے مفکر تھے۔ برصغیر میں اسلام اور قرآن مجید کو اپنی شاعری کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے میں انھوں نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ اقبال کی فکر ناقابل عمل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ میری رائے میں پاکستان سنبھالا دینا ہے تو اسکول کی سطح پر بانگ درا کو نصاب کا حصہ بنانا ہوگا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء سے برصغیر میں اقبال کے خلاف محاذ کھڑا کیا گیا جس میں مخالفت کے انداز مختلف دور میں مختلف رہے اور قیام پاکستان کے بعد بھی ہم نے ان کی شاعری کو زیادہ تر سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

س: اقبالیات سے متعلق اپنے کام کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں؟

ج: میری زندگی میں دلچسپی کے موضوع تین ہی رہے ہیں جو میری کل کائنات ہے۔ قرآن حکیم، تعلیم اور اقبال اور ان تینوں کو سمیٹ لیں تو ایک ہی بنتا ہے اور وہ قرآن حکیم ہے میں سمجھتا ہوں قرآن کے پیغام کو ہی اقبال نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے ریڈیو پاکستان ملتان کے اسٹیشن ڈائریکٹر الیاس عشقی نے فرمائش کی تھی کہ جاوید نامہ کا سرائیکی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ وہ اس کو تمثیل کے رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے پندرہ تماثیل تھیں۔ اس لیے میں نے پوری کتاب کا منظوم ترجمہ کیا۔ میں دراصل علامہ اقبال کے خطبات کا ترجمہ کرنا چاہتا تھا جو میرے مزاج سے قریب تھے۔ لیکن دیگر کاموں میں اس کا اب تک موقع نہیں ملا ہے۔

س: اپنے دور کی کن علمی ادبی شخصیات سے آپ متاثر ہوئے؟

ج: راجہ عبدا یاز ایک اچھے شاعر اور علم دوست از ا تھے۔ انھیں میں نے ۳۴۔۱۹۳۳ء میں اسلامیہ ہائی اسکول ملتان کے ہیڈ ماسٹر پر دیکھا وہ سرائے سدھو اور قادر پور ا ں میں بھی تعینات رہے۔ انھوں نے ا کلوتے بیٹے کی وفات کے بعد اپنا تمام کلام ضائع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا کلام میرا بیٹا ہی سمجھ سکتا تھا۔ ان کا دستیا کلام اس دور کے بعد کا ہے۔ حقہ پیتے تھے اور انتہائی خوددار انسان تھے۔ انھوں نے پیروی اقبال میں اشعار بھی کہے۔ علا بال سے انھوں نے ایک ملاقات بھی کی تھی۔ مولانا عبدالرشید نسیم طالوت بھی اس خطہ کی ایک قدآور علمی ادبی شخصیت تھے۔ انھوں نے قومیت اور وطنیت کے موضوع پر علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے مابین مفاہمت کی کوششیں کی تھیں۔ طالوت بلند پایہ شاعر اور عربی زبان کے عالم تھے۔ انھوں نے کئی حج کیے تھے اور سیاحت کا شوق رکھتے تھے۔ ان دونوں شعرا کی نسبت اسد ملتانی خیال اور فلسفہ کے

لحاظ سے اقبال کے زیادہ قریب ہیں۔ان کا بھی تعلق ملتان سے تھا۔وہ سرکاری ملازم تھے زیادہ تر ملتان سے باہر رہے۔

س: علامہ اقبال سے آپ نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک ملاقات کی تھی۔اس کی کچھ تفصیل بتائیں؟

ج: ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک میرے کالج کا زمانہ ہے اس دوران میں گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور میں پڑھتا تھا اور ینگ مین ہوسٹل میں رہتا تھا۔ بہاول پور کے اسلامی ریاست ہونے کے سبب علامہ اقبال نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے۔ ہوسٹل میں اکثر علامہ اقبال کے اشعار پر بحث مباحثے بھی ہوتے رہتے تھے یہ ۱۹۳۳ء کا سال تھا۔ ہم دو تین دوستوں کے مابین چکبست کے ایک شعر پر مفہوم کے حوالے سے اختلاف رائے ہو گیا، طے یہ پایا کہ علامہ اقبال سے ملاقات کی جائے اور ان کی رائے اس بارے میں پوچھی جائے۔اس مقصد کے لیے ہم لاہور گئے اور علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ اقبال پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے۔ ہم کرسیاں قریب کھینچ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اس محبت اور شفقت سے گفتگو کی کہ ان کی شخصیت کا ڈر اور خوف جاتا رہا۔ انھوں نے ایک گھنٹہ تک چکبست کے اس شعر کے حوالے سے گفتگو کی اور ہمیں مطمئن کیا۔ دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن بادل ناخواستہ ان سے اجازت لی اور واپس عازم سفر ہوئے۔ تمام راستے بہاول پور تک ہم ان کی سحر انگیز شخصیت کے بارے میں محو گفتگو رہے اور اپنی قسمت پر بھی نازاں تھے کہ اس دور کی ایک عظیم ادبی شخصیت سے ہم نے ملاقات کی تھی۔

س: آپ کو ادبی خدمات کے حوالے سے کن کن اعزازات سے نوازا گیا ہے؟

ج: اس سال حکومت نے تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا ہے۔اس سے قبل میرے تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی پر ۱۹۶۹ء میں داؤد ادبی انعام ملا تھا پھر قرآن مجید کے سرائیکی ترجمہ پر ۱۹۸۰ء میں حکومت پاکستان نے ہجرہ ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۷ء میں اکادمی ادبیات نے خواجہ فرید ایوارڈ سے نوازا تھا۔

س: آپ کی رائے میں زندگی کیا ہے اور اسے کیسے بسر کرنا چاہیے؟

ج: زندگی ایک بڑی عالی شان نعمت کا نام ہے۔ اس کو اچھے طریقے سے بسر کرنا چاہیے۔ از ان کر محنت اور مشقت کے عادی ہونا چاہیے۔ ہر کام کو کرنے سے قبل آنکھیں کھول کر اس کا بغور جائزہ لینا چاہیے تب اس پر عمل پیرا ہوں۔ جذبات اور احساسات کو عقل کے تابع رکھیں اور عقل کو قرآن مجید کے تابع رکھیں دنیا میں کبھی ٹھوکر نہیں کھائیں گے یہ ہی پالیسی انفرادی اور اجتماعی اور حکومتی سطح پر ہونی چاہیے۔

یہ ان سے میری گفتگو کا مختصر سا بیان ہے۔ بہتر ہو اگر ان کی اہم تصانیف کے بارے میں بھی بتا دیا جائے جو یہ ہیں۔ ''فردِ فرید''، ''سرائیکی لوک گیت''، ''جاوید نامۂ اقبال''، (منظوم سرائیکی ترجمہ)، ''پیامِ فرید''، ''کونین: اوالی'' (سیرت پاک سرائیکی)، ''سرائیکی زبان اور اس کی علاقائی زبانیں''، ''لغاتِ فریدی''، ''قرآن حکیم کا سرائیکی ترجمہ''۔

ممتاز احمد خان

نثار عزیز کے ناولوں کے کردار

بیگم نثار عزیز بٹ اپنی طرز کی ایسی ناول نگار ہیں جن کے ناول سنجیدگی اور انہماک سے مطالعے کے مستحق ہیں اس لیے کہ ''نگری نگری پھرا مسافر'' سے لے کر ''دریا کے سنگ'' تک اپنے نسوانی کرداروں کے وجود سے مسئلے کو وہ گہرے فلسفیانہ اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے برتتی ہیں۔ ناول کی دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر خاتون ناول نگاروں نے اہم نسوانی کرداروں کی تخلیق میں اپنے زبردست تخلیقی جوہر کو استعمال کیا ہے۔ یہ تاثر عام ہے کہ عورت کو سمجھنا محال ہے تاہم خاتون ناول نگار یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ ایسے کرداروں کو ان کے حقیقی نفسیاتی داخلی اور خارجی تناظر میں کامیابی سے پیش کرتی ہیں جس کی اسے داد ملنا چاہیے۔ نثار عزیز بٹ کے چاروں ناولوں ''نگری نگری پھرا مسافر''، ''نے چراغے نے گلے''، ''کاروانِ وجود'' اور ''دریا کے سنگ'' کی ہیروئنیں Hcroines انتہائی حساس اور آدرش پسند ہیں سوائے ''نے چراغے نے گلے'' کی جمال افروز کے جو حالات سے مفاہمت کا فن جانتی ہے مگر آدرشی بھی ہے۔ دیکھا جائے تو نثار عزیز نٹ کے یہاں مجموعی فن کے حوالے سے ان کی ہیروئنوں کا آدرشی طرز عمل بڑی دلچسپی اور تجسس کا ذریعہ ہے خواہ ان میں سے کوئی اپنی راہ بدل لے!

''نگری نگری پھرا مسافر'' ساتویں دہائی کے آغاز میں منظر عام پر آیا۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے ''افگار'' اس کی ہیروئن ہے جو آدرش پسندی کی انتہا پر ہے۔ بچپن کی محرومیوں نے اسے اپنی ذات میں سمٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک مرحلہ آتا ہے جب وہ ٹی بی کا شکار ہو کر سیناٹوریم میں مقید ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے وجود کے خاتمے کی طرف رواں ہے، جیسے کہ وہ موت سے خوفزدہ سی ہو۔ تاہم ایسا نہیں ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ سکون اور مسرت کی چاہت میں مبتلا ہو اور موت کو ٹھوکر پر رکھتی ہو۔ وہ ہر قسم کے لمحات میں چٹان کی طرح کھڑی نظر آتی ہے۔ ایسا کردار مردوں سے دور رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ منصور اس کی زندگی میں بڑے طمطراق سے آتا ہے، وہ اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ وہ ایک ایسا مرد ہے جو اس کی زندگی میں بہار کے پھول کھلانا چاہتا ہے اور قربت کا بھی خواہش مند۔ وہ جانتا ہے کہ خوب صورت سی پیاری لڑکی میں ایک کشش ہے جو کمزور ہے اور زندگی میں ایک سمت کی متلاشی لیکن وہ جلد باز ہے، اس میں افگار جیسی برداشت اور دھیرج کا مادہ نہیں۔ یوں بہت زیادہ قربت جس میں جسمانی لمس کی خواہش کا بھی اظہار ہو اور پھر دوری! یعنی منصور اس کی زندگی سے خارج ہو گیا۔ حیاتیاتی Biological تقاضے کس طرح ایک جلد باز لڑکے منصور کو دھچکا

پہنچاتے ہیں اس کا اظہار اس ناول میں ہوتا ہے۔ دوسرا کردار عرفان انتہائی جذباتی ہے اور غیر آدرشی بھی، لہٰذا تعلق کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح عابد بھی مسترد ہو جاتا ہے۔ عابد کے حوالے سے اس کی مخصوص سوچ ملاحظہ فرمایئے:

''کتنے شوق سے وہ آسائش عام زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتا ہے جس میں موٹریں ہوں، فریجڈیر ہوں، ایرانی قالین ہوں اور کیا کیا ہو کیا کوثر جیسی کوئی لڑکی اس کے لیے زیادہ آرائشی اور موزوں ثابت نہیں ہوگی؟ میں تو خواہ مخواہ اس کی قدریں گڈمڈ کردوں گی اور نتیجتاً خود بھی گڈمڈ ہو جاؤں گی۔''

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آرائشی نہیں بننا چاہتی یعنی مصنوعی اور کھوکھلی زندگی سے دور رہنا چاہتی ہے۔ وہ نہ اس کی کھوکھلی اقدار کو خراب کرنا چاہتی ہے اور نہ اپنی اقدار کا ماتم کرنا چاہتی ہے۔ اسے وہ ''گڈمڈ'' ہو جانے کے عنوان سے یاد کرتی ہے۔ یہاں اس کی حقیقی شخصیت ابھر کر آتی ہے۔ یہ زبردست آدرش پرستی یا آئیڈیلزم ہے۔ خواہ اس آئیڈیلزم کا حامل شخص ملے کہ نہ ملے۔ اور یوں فنا کی طرف آہستہ آہستہ روانگی جس میں اس کے اپنے نقطۂ نظر سے بقا کی منزل پوشیدہ ہے! یہ ہی سلسلہ خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کی ہیروئن عالیہ کا ہے۔ جب پاکستان بننے کے بعد صفدر اسے ملتا ہے اور مادیت پرستانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اسے اس سے گھن آنے لگتی ہے اور دونوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ عالیہ اس دوری کے انجام پر غور نہیں کرتی۔ زندگی بسر ہو ہی جاتی ہے لہٰذا انجام کی فکر کرنا اس کے لیے عبث ہے۔ سو افگار اور عالیہ کا ایک ہی انجام ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ''تلاشِ بہاراں'' کی راج کماری بھی آدرش پسندی کی آخری انتہا پر ہے ایسے کردار بھی ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس میں دیوی کی سی ناقابل یقین صلاحیتوں اور اعمال نے اس کے کردار کو دھندلا دیا ہے۔ دیکھا جائے تو انسان انسان ہے فرشتہ نہیں۔ ایک خفیف سی کمزوری کا اس میں ہونا بھی لازمی ہے۔ افگار اور عالیہ میں مدمقابل مرد کردار کی کجی اور بشری کمزوری سے مفاہمت کی ظاہر ہے کہ کوئی فطری اور ذہنی صلاحیت نہیں لہٰذا دوری اور ناکامی ان کا مقدر ہے۔

نثار عزیز بٹ کا دوسرا ناول ''نے چراغے نے گلے'' جہاں ''نگری نگری پھرا مسافر'' کے فلسفۂ آدرش پسندی کی توسیع بھی ہے وہاں جمال افروز کے حوالے سے گریز بھی ہے۔ جمال افروز غیر آدرش پسند شوہر کے انتخاب کے معاملے میں خاموش ہے۔ لیکن وہ ایک چھوٹے سے صدیوں سے چلے آرہے یعنی شوہر کی خدمت کو ایمان تصور کرتی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی یہ ناول پاک و ہند کے تاریخی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات کا احاطہ کرتا ہے جہاں مسلم اور غیر مسلم کا صدیوں سے میل جول بھی ہے اور سیاسی آویزشوں کے حوالے سے ملک کی تقسیم کا فسانہ بھی جو کہ حقیقت بن کر رہتا ہے۔ مگر نثار عزیز بٹ نے آدرش کومن موہن اور اس کی بہن پدمنی کی زندگیوں کے حوالے سے برتا ہے۔ من موہن جمال افروز کو دل ہی دل میں چاہتا ہے مگر مذہب آڑے آتا ہے وہ اس دائرے کو نہیں توڑ سکتا لیکن پدمنی لکیر کے دوسرے پار چلی جاتی ہے جب منوہر اس کا دل ہرجائی بن کر توڑتا ہے۔ ردِّعمل کے طور پر وہ ایک مسلمان آئی سی افسر منیر سے شادی کر لیتی ہے یعنی وہ اپنے مذہبی دائرے کو توڑتی ہے اور آسودگی حاصل کر لیتی ہے۔ اس اعتبار سے نثار عزیز بٹ نے اس آدرش پسند لڑکی کا ایک دوسرا روپ بھی دکھایا ہے جس میں معاشرے سے بغاوت پنہاں ہے۔ افگار اور عالیہ اس لکیر کو پار نہیں کر سکتی تھیں یہ ان کے مزاج یا جینز Genes کا تقاضا تھا اور جینز کی دنیا عجیب و غریب، پراسرار اور جو کہیں کہیں ناقابل یقین

ہے۔ ''نے چراغے نے گلے'' کا آخری حصہ خورشید کے فلسفانہ خیالات پر مبنی ہے جو طولانی ہے مگر حکمت سے بھرپور اس میں آدرش پسند کی دوسری سطح ہے یعنی ملک کی آزادی جس کے حصول میں انسان نے فرقہ وارانہ فسادات دیکھے، عورتوں کا اغوا اور بے حرمتی ہوتے دیکھی، آگ لگائے جانے سے عمارتوں کو ڈھیر ہوتے دیکھا، انسان کے وحشی اور درندے بننے کے عمل کو دیکھا اور جسم اور روح پر وہ وہ داغ لگتے دیکھے کہ جس کا اس نے ایک جمے جمائے ماحول میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن ایسا ہی ہو کر رہا! آزادی کی راہ میں ایسے لرزہ خیز واقعات کا ظہور میں آنا اور ازبس ضروری ہے آدرش کی خاطر اجتماعی تباہی و بربادی ہمارے فکشن کا اہم موضوع رہا ہے یہ علاحدہ بات ہے کہ نثار عزیز بٹ اپنے انفرادی کرداروں کو بھی بطور خاص اسی راہ سے گزارتی ہیں۔

افگار کے سلسلے میں ناچیز نے اپنے ایک مضمون ''تین ناولوں کا مثلث آدرش کی اسیری اور نثار عزیز بٹ'' مشمولہ ''اردو ناول کے بدلتے تناظر'' (ویلکم بک پورٹ کراچی ۱۹۹۳ء اور مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور ۲۰۰۷ء) میں لکھا تھا کہ ''افگار کی زندگی کا سفر دو محاذوں پر جاری و ساری دکھایا گیا ہے۔ داخلی محاذ پر وہ اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہے اور خارجی محاذ پر وہ کسی کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ وہ سفر ہے جو اس کی زندگی کی آخری سانس تک جاری و ساری رہے گا۔ یہاں یہ سفر کوئی منزل نہیں تراشتا بلکہ خود ہی منزل و مقصود بن جاتا ہے۔ لیکن ''نے چراغے نے گلے'' میں دیکھا جائے تو اس میں آدرش کو وسیع پس منظر میں دکھاتے ہوئے جمال افروز اور پدمنی پر بات کرتے ہوئے اسے روایتی سوچ میں تبدیلی اور آدرش کی اسیری سے رہائی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ان کے ان دونوں ناولوں کے حوالے سے بجا طور پر قابل ذکر پہلو تھا اور جو بھی نقاد ان دونوں کرداروں کو آدرش کے تناظر میں دیکھے گا شاید اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ بہر صورت آدرش کا موضوع نثار عزیز بٹ کے فن میں انتہائی قابلِ ذکر جزو ہے جو چوتھے ناول ''دریا کے سنگ'' تک میں موجود ہے۔

نثار کا تیسرا ناول ''کاروانِ وجود'' نویں دہائی کے آغاز میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول بھی حسب سابق وجود کے سنجیدہ پہلو کا حامل ہے۔ اس کے دو کردار ثمر صالح اور سارہ ہیں۔ ثمر صالح کی افگار جیسی ہی شخصیت ہے۔ وہ اس اعتبار سے افگار سے تھوڑی سی مختلف ہے کہ اس کی سوچ کا محور وہ کائنات ہے جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ کائنات اس کے مدمقابل ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ کائنات اسے ریزہ ریزہ کرنے کے درپے ہے۔ اس کے متعلق یہ بتایا گیا ہے:

> ''اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ کیسے کسی کو بتائے کہ وہ ایک روح محض ہے اور اس کے جسم سے اس کا ناطہ نہیں جڑا، چناں چہ اس کا کوئی مخصوص جسم، کوئی مخصوص وجود نہیں ہے اور یہ کہ وہ اس گھر کے باسیوں کا زندگیوں کے کنارے سے چپکی اپنے لیے کوئی ہیئت، کوئی خاکہ حاصل کر رہی ہے۔''

یوں دیکھنے میں یہ ابنارمل نظر آنے والی شخصیت ایک ایسی سوچ کی حامل ہے جو عمومی طور پر دوسری حساس لڑکیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ اپنے آپ کو روح سمجھ کر جسم سے علاحدہ تصور کرنا ایک حیرت انگیز و ناقابل یقین نفسیاتی سوچ ہے اور یہ ہی ناقابل یقین صورت

حال مزید ناقابل یقین صورت میں بدلتی ہے جب وہ اچانک (یعنی اپنی روح کو جسم سے جوڑ کر چپکے سے اپنی سہیلی کے شوہر رضا سے شادی کر کے اپنے آدرش پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے ایک مضمون ''نگری نگری پھرا مسافر'' (مشمولہ سیپ شمارہ ۵۰۔ صفحہ ۱۸۷، ۱۹۸۷ء) میں افگار کے لیے فرماتے ہیں کہ مصنفہ نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو حد درجہ ابنارمل ہے، اس میں عجیب وغریب نفسیاتی الجھنیں ہیں جن کی طرف نہ واضح اشارے ملتے ہیں اور نہ ان رویوں کا کوئی جواز نظر آتا ہے۔'' میرا خیال ہے اگر ڈاکٹر عبدالسلام ''کاروانِ وجود'' کے ابنارمل کردار ثمر صالح پر نظر ڈالتے تب بھی ان کی یہی رائے ہوتی لیکن ان کی اس رائے سے متفق ہونا ممکن نہیں کہ افگار کی نفسیاتی الجھنوں کی طرف اشارے موجود نہیں۔ ناول میں اس کے بچپن کی محرومیوں کی جانب اشارے ہیں دوسری بات یہ کہ افگار اور ثمر صالح دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا خارجی ماحول خواہ کچھ بھی ہو اس کی جو شکل بحوالہ اعمال و کردار برآمد ہوتی ہے وہ بڑی پیچیدہ Complex ہوتی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک نہ سمجھ میں نہ آنے والا دریا طوفانی شکل میں اس کے اندرون میں رواں دواں ہوتا ہے جس پر وہ خود ہی قابو پا سکتا ہے یا پھر اس بپھرتے ہوئے دریا سے مغلوب ہو کر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ ہم ایسے کردار اکرداروں پر کف افسوس ہی مل سکتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی سوچیں بھی یوں محسوس ہوتا ہے گویا پردہ غیب سے آ رہی ہیں۔

اس ناول کے آخیر میں دکھایا گیا ہے کہ ثمر صالح زندگی سے مفاہمت کر کے بیرون ملک روانہ ہو جاتی ہے وہاں وہ ایسے سوچتی ہے جیسے اس کی اندر روشنی کی کوئی کرن پھوٹی ہو۔

> ''میں اپنے آپ سے، اپنے سیارے سے اور اپنے ہم جنسوں سے نفرت نہیں کروں گی۔ مجھے خود نفرتی سے نفرت ہے کہ ایک خاص حد سے گزر کر خود نفرتی تخلیق کش ہو جاتی ہے۔''

ان الفاظ سے ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ثمر صالح میں تیسری آنکھ کھل گئی ہے۔ جو اسے فنا، مایوسی اور احساس محرومی سے بچا کر لے جاتی ہے۔ ورنہ اس کا بھی حشر ''افگار'' جیسا ہوتا۔ اس طرح یہ آئیڈیل صورت حال نہ ہوتی۔ بہر صورت ثمر صالح کے یہ آخری الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنے اندر سے اگر خود ہی رہنمائی حاصل کرے تو وہ زیادہ پائیدار ہوتی ہے مگر ایسا لگتا ہے جیسے نثار عزیز بٹ نے جان بوجھ کر ثمر صالح کی کردار نگاری کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اندرون کی آواز آدرشی کردار کو توڑ سکتی ہے جس سے اس کی نفسیاتی الجھن کا حل برآمد ہو جاتا ہے۔ خواہ ایسے کردار کو خود غرض اور مفاد پرست کا نام دیا جائے۔ ناچیز نے اپنی دوسری کتاب ''آزادی کے بعد اردو ناول'' (ہیئت، اسالیب اور رجحانات۔ انجمن ترقی اردو کراچی مطبوعہ ۱۹۹۷ء) میں ثمر صالح کی دوست سارہ کے ان الفاظ کے حوالے سے کہ ''بھئی فطرت نے ایک مخصوص کام عورت کو سونپا، معاشروں نے اس کو پابند اور حقیر بنایا لیکن عورت کی بقا کی حس مضبوط ہے۔ وہ سب سہار گئی۔'' لکھا تھا کہ یہاں یہ دونوں کردار (ثمر صالح اور سارہ) پھر سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور ان کا آدرش زمانے سے مفاہمت میں ڈھل جاتا ہے یہ نئی صورت حال ثمر صالح اور سارہ دونوں کے لیے ارتقائی صورت حال ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ افگار کو بھی اسی طرح سوچنا تھا لیکن اس کا ایسا نہ سوچنا بھی صحیح ہے اس لیے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو عدم مفاہمت اور فنا میں اپنی عافیت ڈھونڈتے ہیں اور ثمر صالح کی طرح بھی ہیں جن کی سوچ میں تبدیلی آ جاتی ہے اور پدمنی کی طرح بھی ایسی عورتیں ہیں جو مذہب

کی سیما پار کر کے آسودگی حاصل کرتی ہیں اور اسی ناول یعنی ''نے چراغے نے گلے'' کا من موہن بھی ہے جسے ہم افگار جیسے آدرش کا حامل تصور کر سکتے ہیں!

نثار عزیز بٹ کا چوتھا ناول ''دریا کے سنگ'' نویں دہائی کے آخیر میں سامنے آتا ہے۔ یہ علامتی انداز کا کرداری ناول ہے جس میں دو کردار ساجد اور کوثر ہیں۔ اس میں بھی ''نگری نگری پھرا مسافر'' کے آدرشی کردار کا ہینگ اوور Hangover موجود ہے۔ ساجد بھی انتہائی حساس ہے۔ وہ نفسیاتی الجھنوں یا یوں کہیے کہ ذہنی الجھنوں کا شکار کردار ہے۔ اس کے مد مقابل کوثر اور ثریا ہیں۔ اس ناول میں ساجد ہر مقام پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں گم ہے ادھر کوثر اپنے باپ کی محبت محرومی کی وجہ سے آدرشی ہونے کے ساتھ ساتھ مرد کی قربت بھی چاہتی ہے۔ ساجد کی زندگی میں سلمے، سمارہ، ثریا اور عائشہ آ چکی ہیں مگر کوئی اسے گرفت میں نہیں لے سکا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی لڑکی اس کی روح کی گہرائی میں نہیں! پہنچ پا رہی ہے، اس کا احساس ہے گویا یہ لڑکیاں اسے اپنے اپنے حصار میں لینا چاہتی ہیں۔ ثریا لندن جانے سے قبل اسے بتا چکی ہے کہ وہ کسی سے محبت کا طالب ہی نہیں ہے اس لیے ناکام ہے یعنی وہ ہمیشہ ناکام رہے گا۔ کوثر اسے خدا حافظ کہے بغیر جا چکی ہے۔ اس صورت حال میں وہ محبت کے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ٹھکرائے جانے نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا ہے۔ وہ سوچتا ہے:

> ''میرے اندر بھی پگھلی برف کا ایک دریا بہنے لگا ہے، مجھ پر پھر سے ایک نشہ سا طاری ہے جیسے محبت کا نشہ ہو۔''

مگر اب وہ گھر آنا چاہتا ہے۔ مگر کون سا گھر؟ یوں لگتا ہے اسے اپنے وقت کے ضیاع کا احساس ہو چلا ہے۔ جان لیوا پچھتاوا۔ اس کے لیے اب پیچھے کی طرف لوٹنا سوہانِ روح ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نثار عزیز بٹ نے شروع کے ناولوں میں عورت کی نفسیات کی کامیاب کھوج کی ہے لیکن ''دریا کے سنگ'' میں مرد کی نفسیاتی تحلیل کی ہے۔ جس طرح ''افگار'' کے دل کی گہرائیوں تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور اس کے آدرش ٹوٹے اسی طرح ساجد بھی لاحاصلی کا عذاب سمیٹنے پر مجبور ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سب اپنے اپنے ماحول، اپنی سوچوں اور اپنے تجربات کے تناظر میں منفرد ہیں خواہ خبطی، سب سے مختلف یا ذہنی طور پر کھسکے ہوئے نظر آتے ہوں لیکن ایسے بھی ہیں! اردو ناول کی دنیا میں اس معاملے میں محض نثار عزیز بٹ ہی کا نام نمایاں نہیں ہے۔ ان سے ہٹ کر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ خدیجہ مستور ہیں جن کے ناول ''آنگن'' کی عالیہ آدرشی کردار ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل'' اور ''آگ کا دریا'' کے نسوانی کردار بشمول چمپا، جمیلہ ہاشمی کے ''تلاشِ بہاراں'' کی کنول کماری ٹھاکر، ''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' کی قرۃ العین طاہرہ، ''دشتِ سوس'' کا منصور حلاج اور کیوں نہ ''آگ کا دریا'' کے گوتم کو بھی ان میں شامل نہ کیا جائے۔ بہر حال ابتدا سے اب تک ایسے کئی ناول تخلیق ہوئے ہیں جن میں اس نوعیت کے چند دوسرے کردار بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کا تذکرہ ایک علاحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

میرے خوابوں کی سرزمین

رئیس فاطمہ

صفحات: ۹۷، قیمت: ۱۵۰ روپے

نوبہار پبلی کیشنز، کراچی

مبصر: محمد احمد سبزواری

گوکہ مصنفہ نے اس کو بھارت کا سفرنامہ قرار دیا ہے جب کہ یہ صرف دو شہروں یعنی دلّی اور آگرہ کی سیر کی کہانی پر مشتمل ہے، یہ سفر ''دوستی بس'' کے ذریعے کیا گیا جو لاہور سے دلّی جاتی ہے، لہٰذا سفرنامے کا آغاز کینٹ اسٹیشن سے ریل میں بیٹھتے ہی شروع ہو جاتا ہے، اہلِ اردو بس میں طرح طرح کے مسافروں سے سابقہ پڑا بعض ہنس مکھ اور بعض چڑچڑے تھے، بس پانی پت اور سرہند کے تاریخی مقاموں سے گزرتی ہوئی دہلی پہنچی۔ مصنفہ نے بس کے حسن انتظام کی تعریف کی ہے دہلی میں انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا، امیر خسرو، مرزا غالب، خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے مزارات پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی، تاریخی عمارتوں میں ہمایوں کا عظیم الشان مقبرہ، لال قلعہ، شاہی جامع مسجد، سیس گنج کا گردوارہ وغیرہ کی سیر کی، مگر مسلمانوں کی سب سے پہلی یادگار قطب مینار نہ جاسکیں۔ آگرہ میں تو قابل دید دو ہی چیزیں ہیں ایک سات عجائبات عالم کا عجوبہ تاج محل اور دوسری فتح پور سیکری میں حضرت سلیم چشتی کی درگاہ۔ جہاں سلطنت مغلیہ کے عظیم شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے آگرہ سے پیدل ننگے پاؤں چل کر حاضری دی تھی، موصوفہ جن جن مقامات پر گئیں اس کا پس منظر تواریخ کے ساتھ بیان کیا اور یوں سفرنامہ ایک تاریخی کتابچے میں تبدیل ہو گیا ہے اور اس کی وقعت کافی بڑھ گئی۔

موصوفہ کو اپنے خوابوں کی سرزمین سے والہانہ شیفتگی میں نہ تو مسلمان ہوٹلوں میں پاکستانیوں کے قیام کی مناہی کا احساس ہوا (واضح رہے کہ یہ بمبئی کے حادثے سے پہلے کا قصہ ہے) نہ سڑکوں پر ٹہلتے سانڈ، فراغت کرتی گائیں اور خوابیدہ کتے نظر آئے۔

یہ سفرنامہ ان کی چھٹی کتاب ہے، پھر ان کو ایک منجھے ہوئے اہل قلم کی شریک حیات اور ایک بلند پایہ عالم اور دانشور شخصیت کی بہو ہونے کا اعزاز حاصل ہے اس وجہ سے ان کی زبان و بیاں میں روانی اور دل کشی نمایاں ہے اور منظر کشی کا لطف

آتا ہے۔ لیکن ایسے سفر کے لیے جیب خاصی بھاری ہونا چاہیے۔

پاؤں میں گرداب

منظر عارفی

صفحات: ۱۹۷، قیمت: ۲۰۰ روپے

سخن پبلی کیشنز، شاہ فیصل کالونی، کراچی

مبصر: محمد احمد سبزواری

ہر انسان میں کچھ جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں، اگر یہ کسی جوہر شناس کی نظر میں آ گئے تو ہیرا بن گئے ورنہ خاک میں مل جاتے ہیں، منظر عارفی کی خوش قسمتی کہ ان کو استاد قمر جلالوی جیسے بزرگ سے بلا واسطہ اور نعت گو شاعر کوثر بریلوی اور عارف اکبر آبادی جیسے اساتذہ سے بالواسطہ استفادہ کا موقع ملا اور یوں ان کو بقول پروفیسر افاق صدیقی ''سلیقے سے شعر کہنے اور اپنی شعری تخلیقات کو لفظ و بیان سے آراستہ کرنے کا ہنر ہاتھ لگ گیا۔'' منظر کوئی بیس پچیس سال سے باقاعدہ شاعری کر رہے ہیں اور اس طویل ریاضت کے بعد اب ان کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آ رہا ہے ورنہ یہاں تو یہ عالم ہے کہ کاتا اور لے دوڑی، کوئی اور ہوتا تو اس عرصے میں اس کے مجموعوں سے الماری بھر جاتی۔ یہ عمل خود ان کی پختہ کاری پر دال ہے۔ اس مجموعے میں سات آٹھ نظمیں شامل ہیں مگر یہ یہ طویل اور مختصر بحروں والی غزلوں کا مجموعہ ہے، منظر سوچ سمجھ کر غزل کہتے ہیں اس لیے غزلوں کی تعداد زائد نہیں گزشتہ پون صدی میں وطن جس نشیب و فراز سے گزرتا رہا اس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں نمایاں ہیں، یہ حساس دل کے مالک ہیں اور ان کی نظر گہری ہے، ان کا یہ شعر دیکھیے:

اگر احساس ہو تو ایک چھالہ بھی قیامت ہے
کسی معصوم محنت کش کی چھوٹی سی ہتھیلی پر

محترم آفاق صدیقی، جناب جاذب قریشی، خواجہ رضی حیدر، اور سرور جاوید نے مضامین کے ذریعے اور اقبال خاور نے فلیپ کا سہارا لے کر ان کی شاعری پر اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے:

عہد آفریں (کلیات)

مصطفیٰ راہی

صفحات: ۵۰۰، قیمت: ۳۴۴ روپے

بلعصر پبلی کیشنز، ۱۴ مزنگ روڈ لاہور

مبصر: محمد ناصر شمسی

مصطفیٰ راہی جگر مرادآبادی کے مداح اور پرستار بلکہ جگر پر تحقیق اور تنقید کے حوالے سے جگریات کے ایک مستند ماہر کا درجہ رکھتے

ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ان کی ایک اور مستند، واضح اور روشن شناخت غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے، بلاشبہ جس کا سہرا بجا طور پر مصطفیٰ راہی کے چھوٹے بھائی مرتضیٰ برلاس کے سر پر باندھا جانا چاہیے جنھوں نے عباس تابش کی معاونت سے ان کا منتخب کلام ۱۹۸۶ء میں شائع کرایا اور اب کلیات ''عہد آفریں'' کی صورت میں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے مہیا کر دیا۔ ورنہ دوسری صورت میں اردو زبان کی ادبی تاریخ میں سخن شعر کا اس یہ سرمایہ یوں ہی کہیں گم ہو جاتا۔

مصطفیٰ راہی کی فکری اور علمی پہنچ کا اندازہ خود ان کے عرض حال میں تحریر شدہ ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> ''شاعری کیا ہے یا شعر کسے کہتے ہیں؟ ان طویل مباحث میں الجھنے کی فرصت نہیں۔ مختصراً اتنا عرض کر سکتا ہے کہ اگر شاعری میں زندگی نہیں یا کسی نہ کسی زاویہ سے زندگی کے لیے مفید نہیں تو کچھ اور ہے شاعری ہرگز نہیں۔''

> ''متاثر میر، غالب، اقبال اور جگر سے زیادہ اور دوسروں سے کم ہوا ہوں۔ تقلیدِ محض کا قائل نہیں، مرعوب کسی سے بھی نہیں ہوا۔''

مصطفیٰ راہی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ باغی نہیں بلکہ انقلابی ہیں۔ ان حوالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معتقد جگر ہونے کے باوجود ان کی انفرادیت اور سخن شعر پر خود اعتمادی اور فن شعر گوئی پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر احمر رفاعی ''وہ غزل کے مزاج شناس ہیں اور غزل اور نظم کی ہیئت و اسلوب کے سبب معانی و فن کے اعتبار سے کیا کچھ امتیازی تہہ داریاں ہیں وہ اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔

ڈاکٹر احمر رفاعی کی مصطفیٰ راہی کے فن شعر گوئی کے حوالے سے یہ رائے کس قدر استناد رکھتی ہے اس کا اندازہ ان کے کلام پر نظر ڈالنے والے کو ابتدا میں ہی ہو جاتا ہے۔

ان کے یہاں فلسفیانہ رنگ بھی موجود ہے:

ہائے وہ زُعم آگہی جس کا
سلسلہ گمرہی سے ملتا ہے

بہت بلند ہے راہی مقام دار و رسن
ہزار شکر کہ جرمِ وفا معاف نہیں

راہی صاحب کے تخلیقی شعور میں سفر کرتا ہوا ان کا سماجی اور سیاسی وژن ملاحظہ فرمایے:

رہنماؤں سے بدظن تو نہیں ہوں لیکن
اف وہ دھوکے جو غریبوں کو دیے جاتے ہیں

ہم اور اجالوں کے طلب گار ہوں اُن سے
یہ چاند ستارے کہ جو پروردہ شب ہیں

راہی صاحب ایک سوچتے رہنے والا ذہن اور دردمند دل کے حامل بھی ہیں، ان کا یہ رخ بھی دیکھیے:

پشتون ہیں، پنجابی ہیں، سندھی ہیں بلوچی
سب کچھ سہی لیکن نہیں انسان الٰہی

تفرقہ ہی تفرقہ ہے رنگ و نسل ملک و قوم
تو اگر انسان ہے تو ہر فرقہ بندی سے گزر

حیات و کائنات کے معاملات میں راہی صاحب کا استدلال ملاحظہ کیجیے:

نامکمل ہے ابھی تک ارتقائے کائنات
آدمی ہے آج بھی اک ناتمام افسانہ سا

ہو سکے تو آج کے انسان کا
جز غم انساں نہیں کوئی علاج

محبت کی دنیا، محبت سراپا
یہاں کوئی خاکی نہ ناری نہ نوری

مہر و مہ و انجم کی تسخیر سے کیا حاصل
دنیا کے خرابے بھی آباد کیے جائیں

انسان دوستی کے ضمن میں ان کی جانب سے ایک اپیل اور دعوت عام ہے، جو ہم سب کے دل کی آواز ہے:

ڈوبتی ناؤ دیکھتے کیا ہو!
دوستو آؤ دیکھتے کیا ہو!
دوستی کیا ہے؟ دشمنی کیسی؟
سب کو اپناؤ دیکھتے کیا ہو!

مختصراً یہ کہ راہی صاحب کا تخلیقی شعور علمی، فکری اور فلسفیانہ نہج رکھتے ہوئے اپنے ماحول سے پوری طرح باخبر ہے اور انسان کی اہمیت اور حیثیت کو ارفع ترین مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے یہاں خیال کی پاکیزگی اور سچائی پوری آب و تاب سے موجود ہے۔

حیات و کائنات کے معاملات ہوں یا یہ کہ عہد حاضر کے سماجی و سیاسی منظر اور پس منظر ان کا شعری سفر نہ صرف ان کا مشاہدہ رکھتا ہے بلکہ ان کا احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ راہی صاحب کے یہاں اس کائنات اور اس زمین کا مرکزی نکتہ انسان ہے اور وہ انسانی جہد اور فلاح کے ضمن میں جس طرح تجزیہ پیش کرتے ہوئے استدلالی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے آگے قدم بڑھاتے ہیں وہ ان کی شخصیت اور فن دونوں کو قابل تقلید درجہ عطا کرتا ہے۔

نگار (پاکستان)

سالنامہ ۲۰۰۸ء

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات: ۱۷۵، قیمت: ۱۰۰ روپے

سی ۲۸، بلاک ۱۳۔ڈی، گلشن اقبال کراچی

مبصر: شہاب قدوائی

ادارۂ نیاز و نگار کے بانی محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگارِ پاکستان کا سالنامہ ۲۰۰۸ء کے طور پر شائع کر کے اَن گنت سوالوں کا جواب دے دیا ہے جو گزشتہ ایک صدی سے تشنہ لب اور معمّہ بنے ہوئے تھے۔ قمر زمانی بیگم، طاہرہ دیوی، شیرازی کے کردار ادب کے لافانی کردار بن گئے ہیں، جن کو فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کرداروں اور ان سے متعلق واقعات نے تو نہ جانے کتنے نئے افسانہ نگار اور شاعروں کی پرورش کر کے ادب کی آب یاری کی اور افسانوی کرداروں کی ایک نئی نسل کی پرورش کر کے تناور درخت بنا دیا۔ افسوس کہ آزادی کے بعد ادبی رسالوں کا فقدان ہوتا گیا، اردو زبان کا رواج کم سے کم ہو گیا ورنہ اس ادبی ماحول میں لاتعداد اعلیٰ اور بڑے افسانہ نگاروں کو گمنامی کے اندھیروں میں گم کر دیا۔

نگار کے سالنامے نے مجدّد نیازی جیسے ایک بھولے بسرے کردار کی کہانی کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دے کر لوگوں کے سامنے زندہ کر دیا ہے۔ مجدّد نیازی کے افسوس ناک قصہ میں نیاز صاحب کی شرافت اور رواداری کا بھی بڑا دخل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے میں انسان کو اتنا بے بس اور مجبور نہ بن جانا چاہیے۔ نیاز صاحب کے دورانِ قیام لکھنؤ غالباً نگار کے آخری دور میں صدیقی صاحب بھی ان کے معاونینِ خاص میں شامل تھے، جنھوں نے کئی خاص نمبروں اور شماروں میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

پیش نظر شمارہ کی اشاعت سے نگار کے سلسلے میں بہت ہی مخفی معلومات قارئین کے سامنے آ گئی ہیں۔ نیاز صاحب ان کی ادبی خدمات، ان کے کارناموں اور زبان و ادب کے سلسلے میں ان کی کی جانے والی خدمات کا احاطہ کرنا مختصر الفاظ میں ممکن نہیں لیکن ایک زریں دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ''نگار'' ۱۹۲۲ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ نیاز فتح پوری کی رحلت کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔

صرف شاعرات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات: ۱۸۴، قیمت: ۳۹۵ روپے

الوقار پبلی کیشنز، لاہور

مبصر: محمد احمد سبزواری

یہ خیال کہ شاعری صرف مردوں کا اثاثہ ہے اور مردانہ شاونیت کو تسکین دینے کا بہانہ ہے۔ دنیا کی قدیم ترین نامور یونانی شاعرہ سیفو تھی جس کے نام اس کتاب کا انتساب ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اکثر صحابیات شعر کہتی تھیں، خود حضرت فاطمہؓ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اپنے رنج وغم کا اظہار اشعار میں کیا تھا۔ بنوعباس کی اکثر بیگمات شاعرہ تھیں۔ اس کتاب میں فارسی کی پہلی شاعرہ رابعہ بنت کعب (اوائل گیارہویں صدی عیسوی کا ذکر ہے، ہوسکتا ہے کہ بابر کی بیٹی گلبدن بانو بیگم شاعرہ ہوں۔ نورجہاں کے بعض فی البدیہ اشعار تواریخ میں ملتے ہیں۔ عالم گیر کی بیٹی زیب النسا تو اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھیں۔ نیاز صاحب نے نگار کے ایک شمارے میں ہندی کی شاعرات میرابائی، ماہ لقا، چندابائی، باز بہادر شاہ مالوہ کی رانی روپ متی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ بھوپال کی تیسری رئیسہ نواب شاہجہاں بیگم (۱۹۰۱۔۱۸۶۸) شیریں/ تاجور دو دیوان اور ایک ہزار اشعار کی طویل مثنوی کی شاعرہ تھیں، ان کی ہم جلیسوں میں منور جہاں بیگم مسرت (بڑی بیگم) مشرف جہاں بیگم شررت (چھوٹی بیگم) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صاحبزادیاں جو رئیسہ کے برادر زادوں سے بیاہی تھیں دونوں صاحب دیوان تھیں، ایک اور بیگم حسن آرا بیگم کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ کلثوم بی ممتاز اور سکندر بیگم ضیا کے بھی دیوان شائع ہوئے تھے۔ بعد کے دور کی تین اہم خواتین کا ذکر ضروری ہے پہلی فرانسیسی نسل کے بھوپالی خاندان کی مس فلورا سارکس شریر، دوسری بھوپال کے سابق وزیراعظم کی صاحبزادی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی گریجویٹ راجکماری سورج کلا سرور جن کے مجموعے ''حریم ناز'' کا مقدمہ فراق گورکھپوری نے لکھا اور تیسری عائشہ بیگم زلفی، حضرت جگر مرادآبادی کی شاگرد، آخرالذکر دونوں کے شعر دیکھیے۔

نگاہ شوق کیا جانے کہ ارمانوں پہ کیا گزری — خبر کیا ہوش والوں کو کہ دیوانوں پہ کیا گزری (سرور)

موسم میں خوشی کے بھی مسرور نہیں ہوتا — کچھ انداز نرالے ہیں جذبات بھرے دل کے (زلفی)

(طوالت کی وجہ سے کئی اور خواتین کا تذکرہ نظرانداز کردیا گیا ہے۔)

کتاب میں دو خواتین کے تذکروں کا ذکر بھی ہے پہلا ''بہارستان ناز'' جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا اور اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس میں ۱۷۲ شاعرات کا ذکر ہے، اس سے پہلے فارسی گو شاعرات کا تذکرہ ''گلشن ناز'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ۵۳ شاعرات کا ذکر ہے۔ ''چمن انداز'' ریختہ گو شاعرات کا تذکرہ ہے۔ اس میں درج شدہ تعداد کل تعداد ۱۴۱ ہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں خواتین کے دو تذکروں کا ذکر کیا ہے۔ پہلا تذکرہ ''ماہ درخشاں'' کے نام سے اردو میں اور دوسرا تذکرہ ''سراپا بہار'' کے نام سے فارسی میں، یہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئے اور ان کے مولف ابوالقاسم محتشم ہیں، اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کو یکسر انداز کرنے کی ہمت نہیں ہوئی جو کہ اچھی بات ہے۔

کتاب میں چونتیس شاعرات کا ذکر ہے، ان میں کلاسیکی شاعری کی ماہ لقا چندا بائی اور فارسی کی پہلی شاعرہ رابعہ بنت کعب اور بھارت سے تعلق رکھنے والی مرحومہ ز۔خ۔ش (اردو کی پہلی انقلابی شاعرہ) جن پر حال ہی میں ڈاکٹریٹ کیا گیا ہے، باقی سب کا تعلق پاکستان سے ہے، البتہ رشیدہ عیاں، ڈاکٹر صبیحہ صبا امریکہ میں اور نجمہ عثمان برطانیہ میں مقیم ہیں۔ یہ دراصل ان دیباچوں، تعارفی مضامین یا تبصروں وغیرہ کا مجموعہ ہے جن کا اظہار فرمان صاحب نے وقتاً فوقتاً کیا ہے۔ شاعرات کی ترتیب ان کے ناموں سے بلحاظ حروف تہجی رکھی گئی ہے، محترمہ ادا جعفری نہ صرف حروف تہجی کے اعتبار سے بلکہ طویل مشق سخن اور ریاضت، اپنی فن کارانہ صلاحیت کی بنا پر بھی اس مجموعے میں پہلے نمبر آنے کی مستحق ہیں، انھوں نے ابتدا ہی سے قاضی عبدالغفار جیسے اساتذہ سے اپنے منفرد لہجے اور زبان و بیان کو منوالیا تھا، ان کے بعض شعر ضرب المثل بن گئے ہیں جیسے:

ایک بار ترے لب پہ مرا نام ہی آئے　　آئے تو سہی برسر الزام آئے

یا

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا　　یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

اور دوسری شاعرات کے بعض شعر ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں جیسے رشیدہ عیاں کا یہ شعر:

مجھ کو تو اس دیش میں بھیا موہ ملی نہ مایا　　بیٹھے بیٹھے سوچوں ہوں کیا کھویا کیا پایا

یا ڈاکٹر صبیحہ صبا کا یہ شعر:

یہ سخن کا شیش محل مرا، تحیرات کی دھند میں　　مجھے صیقلی کا ہنر سکھا جو ان آئینوں کو اجال دے

شاہدہ حسن کا یہ شعر:

میں نے جب بھی کبھی جانے کی اجازت چاہی　　اس نے بڑھ کر مرا اسباب سفر کھول دیا

''کمہار آج بھی کچے گھڑے بناتا ہے'' ثروت سلطانہ ثروت کا یہ مصرعہ سن کی حمایت علی شاعر پھڑک گئے اور ان کے مجموعے پر دیباچہ لکھ دیا۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنی فن کارانہ اپج کے مطابق بعض شاعرات کی خصوصیات کو چند لفظوں میں سمو دیا ہے، جیسے ادا جعفری۔ آج کی شاعری کا ایک معتبر نام، بینا حسن، جاگتے ہوئے احساس کی شاعرہ، پروین جاوید، کیف پرور نعتوں کی امین، ثروت سلطانہ، اجتماعی سوچ کی شاعرہ رشیدہ عیاں، ایک قادرالکلام شاعرہ، سعدیہ روشن، روشن مستقبل کی شاعرہ، شاہدہ حسن حرارت و حرکت اور روشنی کی پیامبر، صبیحہ صبا، فکر و جذبے کے امتزاج کی شاعرہ، نسیم سید کرب، احساس اور رجائی نقطہ نظر کی شاعرہ۔ آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ اردو کی منتخب شاعرات کا مجموعہ نہیں ہے اسی لیے اس میں پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن وغیرہ کے نام نہیں ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔

گردوپیش

چینی ادیبوں کا دورہ انجمن ترقی اردو

۲۶ فروری ۲۰۰۹ء کو دوست ملک چین کے پانچ ادیبوں نے انجمن ترقی اردو (پاکستان) کا دورہ کیا۔ ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ان کے استقبال کے لیے صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان موجود تھے۔ چینی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ چینی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری، اکادمی ادبیات (اسلام آباد) کے ڈائریکٹر جنرل جناب ظہیر الدین ملک، اکادمی ادبیات سندھ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر جناب آغا نور محمد پٹھان بھی تھے۔

سب سے پہلے چینی ادیبوں کو کتب خانے کا دورہ کرایا گیا۔ انھوں نے کتابوں اور مشاہیر کی تصاویر میں گہری دلچسپی لی۔ نائب معتمد جناب امراؤ طارق نے انھیں انجمن کی تاریخ نیز بابائے اردو مولوی عبدالحق کی عظیم خدمات سے روشناس کرایا۔ ریڈنگ روم میں چینی ادب کے تراجم دیکھ کر وفد کے ارکان نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

لائبریری کے دورے کے بعد وفد کو جناب آفتاب احمد خان کی صدارت میں اسٹیج پر بٹھایا گیا جہاں خصوصی طور پر مدعو کیے ہوئے سامعین نے ان کا تالیوں سے استقبال کیا۔ وفد کے ساتھ ساتھ جناب ظہیر الدین ملک اور سفارت کے فرسٹ سیکرٹری بھی موجود تھے۔

جناب امراؤ طارق نے خیر مقدمی کلمات کہے اور وفد کا تعارف کرایا۔ تقریب کے بعد فوٹو سیشن ہوا اس کے بعد چینی ادیبوں کے دورۂ پاکستان کو بالخصوص اور انجمن ترقی اردو (پاکستان) کو بالعموم انھوں نے پاک چین دوستی کے فروغ کا ذریعہ بتایا۔ چینی ادیبوں کے وفد کے سربراہ جناب یے شین نے جوابی تقریر میں دونوں ملکوں کے ادیبوں کے ایک دوسرے کے ملک میں دورے کو ایک سعادت قرار دیا اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی جس پر وقفے وقفے سے سامعین نے تالیاں بجا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

چینی ادیبوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب چینگ گیوٗ، جناب لینگ، جناب شوچن کیاوٗ، جناب لی چنگ چی، جناب تھانگ ینگ شینگ (مترجم اور اردو کے ادیب و استاد) جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ جناب یے شین وفد کے سربراہ تھے۔ دیگر تحریروں کے علاوہ آپ کا اختصاص ڈرامہ نگاری ہے۔ ان کے ٹی وی سیریلز خاصے مقبول ہوئے۔ آپ انعام یافتہ ادیب ہیں اور مختلف ادبی تنظیموں کے اہم عہدے دار ہیں۔

(رپورٹ: ادارہ)

مرحوم تابش دہلوی اور ابن انشا پر انجمن میں گفتگو کا پروگرام

۲۸ر فروری ۲۰۰۹ء کو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ''بیادِ رفتگاں'' کے عنوان سے محترم تابش دہلوی اور جناب ابن انشا کے لیے ایک ادبی محفل سجائی گئی جس میں خواجہ رضی حیدر، ناصر شمسی اور سعود تابش نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب کی ابتدائی نظامت نائب معتمد امراؤ طارق نے انجام دی اور بقیہ تقریب کی نظامت معروف شاعر و ادیب جناب سرشار صدیقی نے انجام دی۔ سب سے پہلے ناصر شمسی نے اپنا مقالہ ابن انشا پر پڑھا انھوں نے کہا کہ شاعری میں وہ زندگی کی صداقتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے یہاں مجموعی طور پر زندگی ہی رقصاں نظر آتی ہے۔ جہاں تک ان کے فکاہیہ کالموں اور مزاحیہ تحریروں کا تعلق ہے وہ ہنستے مسکراتے کرداروں کے اندرون کو بیان کرتے ہیں اور ان کی خوشیوں اور غموں کو ہمارے شعور کا حصہ بناتے ہیں جن سے ہم بے تحاشا محظوظ ہوتے ہیں۔ ناصر شمسی کے مقالے کو پسند کیا گیا۔ نظامت کے دوران سرشار صدیقی صاحب نے ابن انشا کے بارے میں بتایا کہ وہ مخلص انسان تھے، انھوں نے آئین ساز اسمبلی میں مترجم کے طور پر کام کیا تھا جو انتہائی ذمے داری کا کام تھا۔ گنار میرڈل کی مشہور کتاب ''دا ایشین ڈرامہ'' کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا، او ہنری O-Henry اور ایڈگر الین پو Edgar Allen Poe کے تراجم اس کے علاوہ تھے۔ انھوں نے رائٹرس گلڈ کے تحت خود مختار ادارہ ''گلڈ کتاب گھر'' کی تشکیل کی پھر ''گلڈ پبلشنگ ہاؤس'' بنایا۔ یہ دونوں منصوبے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ بہترین منتظم بھی تھے۔ جس کا مشاہدہ ہم نے رائٹرس گلڈ میں ان کی سرگرمیوں کے دوران کیا مجموعی طور پر وہ بھرپور شخصیت تھے۔ تابش دہلوی صاحب کے بارے میں سرشار صدیقی صاحب نے فرمایا کہ وہ بزرگ شاعر اور نقاد تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کو متاثر کیا۔ وہ ایسی شخصیت تھے جن پر صبح سے رات تک گفتگو کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ چار پانچ بار عمرے کے سلسلے میں ان کے ساتھ سعودی عرب جا چکے ہیں۔ محشر بدایونی بھی ان کے ساتھ تھے۔ روحانی معاملات کے علاوہ گفتگو کی محفل بھی سجا کرتی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ سب سے خوبصورت جملہ یا فقرہ تابش مرحوم کی جانب سے آتا تھا۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ آیئے ان کے بارے میں ان کے گھر کی گواہی پیش کی جائے اس کے بعد مرحوم کے صاحبزادے جناب سعود تابش نے ان کے شب و روز اور ادب سے ان کے کمٹ منٹ کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جس کو سامعین نے بڑے انہماک سے سنا۔ مجموعی طور پر انھوں نے تابش صاحب کے بارے میں چند ایسے گوشے بھی بے نقاب کیے جن سے سامعین نا آشنا تھے۔

واضح رہے کہ مرحوم تابش کو براڈ کاسٹنگ کے شعبے میں ملکہ حاصل تھا، ان کو قدرت نے خوبصورت آواز سے نوازا تھا۔ ان کا خبریں پڑھنے کا جداگانہ انداز تھا۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ بڑے آدمی تھے اور اپنی معلومات کے اعتبار سے وہ لغت سے آگے کی چیز تھے، صحت الفاظی ان پر ختم تھی۔ لفظ کے معنی اور اس کے استعمال کے لیے اہل علم ان سے رجوع کرتے تھے۔ اس عہد کے بڑے نقاد اور محقق نیز افسانہ نگار و ناول نگار جناب ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی ان کے کلام اور فن کے معترف

ہیں۔ اسی طرح شاہد احمد دہلوی اور دیگر کئی نقادوں نے ان کے فن کو سراہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ساٹھ سال کے عرصے میں تہذیب وتمدن کی ایک توانا آواز تھے۔

جناب خواجہ رضی حیدر نے تابش مرحوم پر ایک بھرپور مقالہ پیش کیا اور بتایا کہ جب بزم طلبا میں شرکت کے دوران ان سے رابطے ہوتے تھے تاکہ مائیک پر آنے سے قبل مواد کی تصحیح ہو جائے، درست لہجہ استوار ہو جائے اور غلطیوں کا امکان باقی نہ رہے۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے اسی لیے لوگ ان سے قریب ہو جاتے تھے۔ وہ فضیلتوں کے چراغ روشن کرتے تھے۔ انھوں نے فانی اور غالب دونوں سے استفادہ کیا لیکن اپنی علاحدہ شناخت بنائی۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ روایت اور جدت کے درمیان اپنی شاعری میں انھوں نے توازن قائم کیا۔ ان کے یہاں فکر اور خیال کی فراوانی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، سلیم احمد اور دوسرے کئی نامور ادیبوں نے ان کے فن کو سراہا ہے، شعر وادب سے ان کی وابستگی ایک قدرتی امر ہے اس لیے کہ وہ خود بھی ایک ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے تو انھوں نے شعر کہنا شروع کیے۔ ان کے نزدیک مشاعرہ ''سماجی تہذیب کی تشکیل کا ذریعہ تھا۔ انھوں نے تقریباً پانچ ہزار مشاعروں میں شرکت کی۔ خواجہ رضی حیدر نے ان کے مجموعوں ''نیمروز''، ''چراغ صحرا''، ''غبار انجم'' وغیرہ سے مثالیں دیں اور ان کے کئی خوبصورت اشعار سنائے جنھیں سامعین نے دلچسپی سے سنا۔ انھوں نے ان کی کلیات ''کشتِ وفا'' کا تذکرہ کیا جو ان کے شاگرد نعیم میرٹھی نے مرتب کیا اور جو ان کے فن کا ہشت پہلو آئینہ ہے۔

محفل کے اختتام سے قبل انجمن کے نائب معتمد دوم جناب حسن ظہیر نے تابش دہلوی اور ابن انشا کے فن وفکر کا احاطہ کیا اور اپنی جانب سے سامعین کو شکریہ بھی ادا کیا۔

آخیر میں حسب روایت صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان نے خطاب کیا اور اپنے دلائل سے ثابت کیا کہ جناب تابش دہلوی اور ابن انشا اردو ادب کے بڑے شعرا اور ادبا میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان حضرات نے زندگی کی تفہیم، تعبیر اور تفسیر میں اپنا اپنا کردار انجام دیا۔ انھوں نے تابش صاحب کو مثالی انسان قرار دیا اور ابن انشا کو شاعری اور مزاح نگاری کے حوالے سے قابل تعریف ادیب قرار دیا اور کہا کہ یہ دونوں حضرات اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے جناب آفتاب احمد خان نے سامعین کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے انجمن کی تقریب میں شرکت کے لیے وقت نکالا۔

آخیر میں مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔

(رپورٹ: ادارہ)

آرٹس کونسل کی ٹاک شو کمیٹی کی جانب سے تقریب ''جمیل الدین عالی۔ ایک عہد'' کا انعقاد

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر آفتاب احمد خان نے کہا ہے کہ ڈاکٹر جمیل الدین عالی کی علمی اور ادبی خدمات ناقابل فراموش

ہیں، انھوں نے ادب کی مختلف جہتوں پر کام کیا ہے، ان کی شخصیت پاکستان کے لیے ایک نعمت ہے، ان کی تحریروں سے ان کی حب الوطنی نمایاں ہے۔ان خیالات کا اظہار انھوں نے آرٹس کونسل کی ٹاک شو کمیٹی اور انجمن ترقی اردو کے اشتراک سے اردو کے ممتاز شاعر ادیب و دانشور ڈاکٹر جمیل الدین عالی کے اعزاز میں منعقدہ تقریب سپاس کے موقع پر صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کا عالی جی سے رقابت کا عرصہ ۶۰ برسوں پر محیط ہے اس دوران انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت خلیق انسان ہیں اور اردو زبان و ادب سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کو فعال بنانے میں انھوں نے جو کردار ادا کیا وہ ایک مثال ہے۔ اردو یونی ورسٹی کا قیام بھی ان کی جدوجہد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ممتاز شاعر سرشار صدیقی نے کہا کہ میں گزشتہ ۵۳ برس سے عالی صاحب کو جانتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان رائٹرس گلڈ کے حوالے سے عالی صاحب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ جمیل الدین عالی کی شاعری میں سماجی اور معاشرتی زندگی کا عکس نمایاں ہے۔ بلاشبہ وہ ادب کا گراں قدر اثاثہ ہیں۔ ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ عالی صاحب ہم سب کے لیے ''رول ماڈل'' کی حیثیت رکھتے ہیں، مختصر وقت میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی زندگی کا رخ ایک پورا مقالہ چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا طویل نظمیہ ''انسان'' ان کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اس موضوع پر بھی تفصیلی اظہار خیال کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ پوری صدی انسانی ذہن کی صدی ہے، ان کی نظم ''انسان'' تخلیقی اعتبار سے اہم ترین نظموں میں شمار ہوگی۔ سحر انصاری نے ''انسان'' پر بہت گہرائی میں جا کر گفتگو کی جسے سامعین نے انہماک سے سنا۔ اور بھرپور داد دی۔ ممتاز ادیب اور صحافی احفاظ الرحمٰن نے کہا کہ ہمارے منتشر اور زبوں حال معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر عالی صاحب نے قلم اٹھایا ہے، وہ نہایت جرأت مند اور بے باک انسان ہیں۔ انھوں نے عالی صاحب کی سامراج دشمنی کی تعریف کی۔ ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں ان احباب کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک مجھ سے محبت کرنے والے موجود ہیں میں لکھتا رہوں گا۔ لکھنا پڑھنا میری زندگی کا نصب العین ہے میں آخری دم تک اپنے اس مشن کو جاری و ساری رکھوں گا۔ ٹاک شو کمیٹی کے چیئرمین معروف ادیب اور صحافی حسن ظہیر نے متاثر کن انداز سے نظامت کے فرائض انجام دیے جب کہ نقاش کاظمی نے ۲۰۰۰ء میں شمالی امریکا میں منعقدہ جشن جمیل الدین عالی کے حوالے سے تقریر کی جس کا عنوان تھا ''جمیل الدین عالی، شخصیت اور خدمات'' پروفیسر نوشابہ صدیقی نے عالی صاحب کی خاکہ نگاری کو موضوع بنایا۔ اور ان کی خاکہ نگاری کے ہر پہلو کو بیان کرنے کے بعد مشہور انگریزی نظم کے مصرعے Twinkle Twinkle Little Star, How I Wonder What You Are! کو دہرایا۔ پی آئی اے کے سلطان حسن نے عالی صاحب سے مشہور زمانہ مصور صادقین کے ساتھ جو یادگار ملاقات کی تھی اس کے حوالے سے بات کی اور عالی صاحب کو اہم ادبی شخصیت قرار دیا۔ شاعرہ ثروت زہرہ نے جو خود بھی اچھے دوہے کہتی ہیں عالی صاحب کے دوہے پڑھنے کے بعد اپنے دوہے سنائے۔ پی ٹی وی ہوم کے ڈائریکٹر اور معروف شاعر تاجدار عادل نے عالی صاحب کے نظمیہ ''انسان'' سے چند اقتباسات سنائے۔

(رپورٹ: ادارہ/روزنامہ جنگ)

کراچی سٹی کی نائب ناظمہ نسرین جلیل صاحبہ کا ''ہمارا کراچی فاؤنڈیشن'' کے تحت مزاحیہ مشاعرہ سے خطاب

قائم مقام سٹی ناظمہ نسرین جلیل نے کہا ہے کہ آرٹ اور شاعری دونوں انسان کے احساسات کی ایک خوبصورت زبان ہے۔شہر میں مشاعروں کے انعقاد کی روایت کو فروغ دینا ہوگا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی وثقافتی سرگرمیوں کو بھی اجاگر کیا جائے۔''ہمارا کراچی فاؤنڈیشن'' کے تحت مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے،مزاحیہ مشاعرے نہ صرف یہ کہ تلخ حقائق کو شگفتہ انداز میں بیان کرنے کا ذریعہ ہیں بلکہ اس طرح کے مشاعروں سے عوام کو ذہنی سکون اور خوشی بھی ملتی ہے۔ان خیالات کا اظہار انھوں نے سٹی کونسل نائب ناظم سیکریٹریٹ کے ایم سی بلڈنگ میں ''ہمارا کراچی فیسٹول ۲۰۰۹ء'' کے حوالے سے منعقدہ مزاحیہ مشاعرے کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔مشاعرے کا اہتمام ''ہمارا کراچی فاؤنڈیشن'' کی جانب سے کیا گیا تھا۔ مشاعرے میں معروف شعرائے کرام اطہر شاہ خان (جیدی)، روبینہ تحسین بینا، حسنین جلیسی، حسیب قاضی، عذرا صادق، سعید آغا، عبدالحکیم ناصف، شیخ نصرت علی اور حیدرآباد سے آئے ہوئے۔م۔ش عالم اور عنایت علی خان نے حصہ لیا جب کہ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر امیر الاسلام ہاشمی نے کی۔اس موقع پر مشاعرے کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے قائم مقام سٹی ناظم نسرین جلیل نے کہا کہ جہاں ایک جانب سٹی گورنمنٹ کراچی کی جانب سے شہر کے انفراسٹرکچر کی درستی کے بعد زندگی آسان ہوگئی ہے وہیں دوسری جانب ''ہمارا کراچی فیسٹول'' میں شامل مختلف تقریبات کے باعث عوام کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا ہے۔

(روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

تقریب ''بیادِ فیض'' سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا خطاب

معروف نقاد اور دانشور ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کہا کہ فیض احمد فیض نے پاکستان میں اردو ادب اور ثقافت کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہر کلچر کی اپنی پہچان ہوتی ہے، وہ ملک کی تمام زبانوں سے محبت کرتے تھے، یہ بات انھوں نے مرزا آڈیٹوریم میں اکیڈمی ادبیات کی جانب سے فیض احمد فیض کے یوم ولادت کے موقع پر تقریب ''بیادِ فیض'' کے موقع پر صدارتی خطاب میں کہی، انھوں نے کہا کہ فیض احمد فیض نے نہ صرف اچھی شاعری کی بلکہ ایک اچھی سوچ بھی پیدا کی، انھوں نے کہا کہ فیوڈل ازم کے خاتمے تک ثقافت پروان نہیں چڑھ سکتی، تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ادیب شاعر مسلم شمیم نے کہا کہ فیض احمد فیض سے محبت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، وہ خلوص اور سچائی کے پیکر تھے، ان کی ترقی پسندانہ شاعری نے انھیں بہترین شاعر کا درجہ دیا، معروف شاعر صبا اکرام نے کہا کہ فیض احمد فیض نے اپنی

شاعری کو مغرب سے بچا کے رکھا وہ نظریے اور جذبے کو ساتھ لے کر چلتے رہے۔ تقریب سے قمر یوسف زئی، ڈاکٹر محمد علی رانجھی نے بھی خطاب کیا۔ اکادمی ادبیات سندھ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان نے اس موقع پر مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''ایکسپریس''، کراچی)

''شیخ ایاز مزاحمتی شاعری میں بہت بڑا نام ہے۔'' سسی پلیجو

صوبائی وزیر ثقافت و سیاحت سسی پلیجو نے کہا ہے کہ شعر و ادب سرحدوں کے پابند نہیں۔ شیخ ایاز مزاحمتی شاعری میں بہت بڑا نام ہے، انھوں نے ساری زندگی اپنی دھرتی اور اس کے مظلوم عوام کے لیے آواز بلند رکھی، وہ غیر عوامی حکومتوں کے دوران جیلوں میں رہے لیکن اپنے مشن پر گامزن رہے۔ یہ بات انھوں نے شیخ ایاز کی ۸۴ ویں سالگرہ کے موقع پر محکمہ ثقافت و سیاحت سندھ کے تحت منعقدہ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کہی۔ اس موقع پر ممتاز دانشور ڈاکٹر محمد علی صدیقی، یوسف جمال، قمر شہباز، آغا سلیم، مظہر جمیل، ڈائریکٹر جنرل ثقافت و سیاحت مونس ایاز، ڈاکٹر فاطمہ حسن، ذوالفقار علی ہالیپوتہ، پروفیسر آفاق صدیقی، غلام حسین انگیز، ڈاکٹر قاسم بگھیو سیکرٹری ثقافت شمس جعفرانی، ڈاکٹر محمد علی مانجی نے بھی خطاب کیا اس موقع پر صوبائی وزیر سسی پلیجو نے شیخ ایاز کے صاحبزادے مونس ایاز، یوسف جمال، شمس جعفرانی اور دیگر کے ہمراہ ۸۴ ویں سالگرہ کا کیک بھی کاٹا۔ سسی پلیجو نے اپنے خطاب میں مزید کہا کہ فراز، فیض، شیخ ایاز جیسے مزاحمتی شاعر لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں، محکمہ ثقافت نے ان کی کلیات کا اشاعت کا فیصلہ کیا ہے جس کی ۲۲ جلدیں شائع کی جائیں گی ابتدائی طور پر دو جلدوں کا اجراء آج کیا جا رہا ہے۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

''فیض ڈے لیکچر'' کے موقع پر ڈاکٹر جعفر احمد کا خطاب

پروگریسو یوتھ فرنٹ کراچی کی جانب سے انقلابی شاعر فیض احمد فیض کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ''فیض ڈے لیکچر'' کا انعقاد کیا گیا، پروگرام میں ڈاکٹر جعفر احمد نے فیض احمد فیض کی ترقی پسند ادب اور سیاست میں کردار پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ وہ برصغیر کے بہت بڑے انقلابی شاعر تھے، ان کی شاعری ہر دور میں انقلابی فکر کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئی، پاکستان کی انقلابی سیاست میں ان کی شاعری نے اہم کردار ادا کیا، انھیں ترقی پسندی کے سبب قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی، انھوں نے عربی اور انگریزی میں ایم اے کیا تھا، عربی کے مطالعے نے ان کو اس لیے ممتاز بنایا کہ عربوں کے جس دور کو جاہلیت کہا جاتا ہے اس دور کی شاعری شاہکار

شاعری تھی جس کے عرب تہذیب پر اثرات آج بھی موجود ہیں، عربی شاعری کا جادو فیض کی شاعری میں منعکس نظر آتا ہے، انھوں نے کہا کہ فیض کی شاعری کی لفظیات روایتی ہیں لیکن مفاہم جدید ہیں فیض نے ہمیشہ مزاحمت کا ساتھ دیا قوموں کی حق وخود اختیاری کا ساتھ دیا، اس موقع پر پروگریسو یوتھ فرنٹ کراچی کے سکریٹری موہن جیون نے ادارے کا تعارف پیش کیا، جس کا مقصد نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی سیاسی، سماجی، معاشی تعلیم اور روزگار جیسے مسائل پر روشنی ڈالنا ہے، لیبر پارٹی پاکستان کے یوتھ سکریٹری کامریڈ فیض کیریو نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''ایکسپریس''، کراچی)

ممتاز غزل گو شاعر شبنم رومانی دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے

پاکستان کے ممتاز غزل گو شاعر اور ادبی دنیا کی مشہور شخصیت شبنم رومانی طویل علالت کے بعد منگل کو کراچی میں انتقال کر گئے، ان کی عمر ۸۰ سال تھی، وہ گزشتہ کئی سال سے علیل تھے لیکن ایک ہفتہ قبل نمونیہ کے شدید حملے کے باعث انھیں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا، انھیں پھیپھڑوں اور سانس کی تکلیف تھی۔ شبنم رومانی کا اصل نام مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی تھا، وہ ۱۹۲۸ء کو بھارت کے شہر شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد پاکستان آ کر کراچی میں سرکاری عہدے پر فائز ہوئے، ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اردو ادب کا خوبصورت رسالہ ''اقدار'' کے نام سے شائع کیا تاہم بعد میں یہ رسالہ ان کی علالت کے باعث بند ہوگیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''مثنوی سیر کراچی'' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا جس نے بے حد مقبولیت حاصل کی، ان کے دیگر شعری مجموعوں میں جزیرہ، تہمت، ہمالہ، حرف نسبت قابل ذکر ہیں، ۱۹۹۰ء میں امریکا میں جشن شبنم رومانی منایا گیا، مرحوم نے بھرپور زندگی گزاری، ان کے شاگردوں میں جاذب قریشی، ڈاکٹر شاہد الوری، انجم جاوید، جینا شبنمی، سحر اقبال، نصیر احمر قابل ذکر ہیں۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ، دو بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں، ان کی نماز جنازہ میں ادبی، سماجی، سیاسی شخصیات جن میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر پیرزادہ قاسم، رئیس علوی، جاذب قریشی، اظہر عباس ہاشمی، ایم آئی ارشد و دیگر نے شرکت کی۔

(رپورٹ: روزنامہ ''ایکسپریس''، کراچی)

''کتاب کلچر مذاکرے'' سے ممتاز شاعر انور شعور کا خطاب

ہمیں اپنے بچوں میں بچپن سے ہی کتب بینی کا شوق پیدا کرنا چاہیے تاکہ مضبوط اور ترقی یافتہ معاشرے کے قیام کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم ہوسکیں، یہ بات ممتاز شاعر انور شعور نے بزم فروغ ادب وفن اور فرید پبلشرز کے تحت انجولی سوسائٹی میں چوتھے کتاب کلچر مذاکرے میں گفتگو کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ علم کسی کی میراث نہیں اور نہ ہی کوئی اسے تقسیم کرسکتا ہے۔ کتب میلے کو سراہتے

ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک ہی چھت تلے تمام علوم وزبانوں پر کتابوں کا ذخیرہ قارئین کتب کو رعایت سے ان کی دہلیز پر فراہم کرنا علم دوستی کا ثبوت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر فاطمہ حسن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ زندگی میں رنگ کتاب کے قریب رہنے اور زندگی میں نکھار پیدا کرنے کے لیے کتاب ہی واحد ذریعہ ہے، حکومتی سطح پر کتب میلوں کی اہمیت اجاگر کرنا ضروری ہے۔ فرید حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ بنی نوع انسان کو زندگی سے آشنا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اقرا کا درس دیا، معاشرے میں جو بگاڑ ہے اس میں بہتری کے نتائج کتاب اپنانے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں، کتاب کلچر مذاکرے میں حامد علی سید، احمد سعید فیض آبادی، اختر ہاشمی و دیگر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''ایکسپریس''، کراچی)

قمر علی عباسی کے سفرناموں کی تقریب سے ادب دوست معین الدین حیدر کا خطاب

سابق گورنر سندھ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ ملک انتہائی مشکل حالات سے گزر رہا ہے، جمہوری اقدار پامال ہو رہی ہیں، اس نازک وقت صبر وتحمل اور بردباری کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے ایک مقامی ہوٹل میں ویلکم بک پورٹ کی جانب سے امریکا میں مقیم اردو کے ممتاز ادیب اور کالم نگار قمر علی عباسی کے سفرناموں میں میکسیکو کے میلے اور ہندوستان ہمارا کی تعارفی تقریب کے موقع پر صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قمر علی عباسی ایک جہاندیدہ سفرنگار ہیں، وہ گزشتہ کئی برسوں سے امریکا میں مقیم ہیں، اب انھیں پاکستان کا سفرنامہ بھی تحریر کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ آج قمر علی عباسی کے سفرناموں کی سلور جوبلی ہے۔ مہمان خصوصی ممتاز شاعر ادیب اور صحافی محمود شام نے کہا کہ قمر علی عباسی واحد پاکستانی ہیں جو کتابوں کی صورت میں اپنا سرمایہ پاکستان لا رہے ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

بہادر یار جنگ اکیڈمی کے زیر اہتمام حیدرآباد دکن کی علمی وادبی خدمات پر تقریب

گزشتہ دنوں بہادر یار جنگ اکیڈمی کے زیر اہتمام ''حیدرآباد دکن کی علمی وادبی خدمات'' کے موضوع پر ایک پروقار تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت انجمن ترقی اردو کے صدر محترم آفتاب احمد خان نے کی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کی سعادت ڈاکٹر سید وسیم الدین اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت ڈاکٹر محمد بلال نے حاصل کی۔ اکیڈمی کے صدر پروفیسر میر حامد علی نے اکیڈمی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی جب کہ جنرل سکریٹری پروفیسر خواجہ قطب الدین نے تعارفی کلمات ادا کیے۔ جن مقررین نے حیدرآباد دکن کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی ان میں محترم ظفر

محی الدین، ڈاکٹر ثمر سلطانہ، جناب اصغر علی دشتی کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر ثمر سلطانہ نے برصغیر میں حیدرآباد دکن کے خواتین کی علمی و ادبی خدمات پر سیر حاصل مقالہ پیش کیا جسے سراہا گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے وحیدہ نسیم، واجدہ تبسم، بیگم نواب بہادر یار جنگ کا خاص طور پر ذکر کیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ثمر سلطانہ نے برصغیر کی سیاست میں خواتین کے کردار پر جامعہ کراچی سے گزشتہ سال پی ایچ ڈی کیا ہے اور وہ جامعہ کراچی میں شعبۂ سیاسیات سے وابستہ ہیں۔ جامعہ اردو کے شعبۂ بین الاقوامی تعلقات کے استاد جناب اصغر علی دشتی نے حیدرآباد دکن خصوصاً میر عثمان علی خاں کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد دکن کے علمی و ثقافتی ماحول میں عناصر خمسہ کا کلیدی کردار رہا ہے۔ ان عناصر خمسہ میں مولانا مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ، نواب بہادر یار جنگ، امجد حیدرآبادی اور محترم محی الدین کے نام شامل ہیں۔ جناب ظفر محی الدین نے اپنے مخصوص انداز میں حیدرآباد دکن کی تاریخ کا جائزہ لیا۔ انھوں نے خوبصورت مثالوں کے ساتھ حیدرآباد کی علمی، سماجی، ادبی، دینی، ثقافتی، تحقیقی اور تخلیقی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد دکن کی خدمات صرف برصغیر تک محدود نہیں تھیں بلکہ سارا عالم اسلام اس کے فیوض سے فیض یاب ہوا ہے جن میں ترکی، مشرق وسطیٰ اور سعودی عرب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

صدر تقریب جناب آفتاب احمد خاں نے کہا کہ حیدرآباد دکن کی خدمات کو نہ سراہنا ناانصافی اور تاریخی حق تلفی ہوگی۔ قیام پاکستان اور ترقی استحکام پاکستان میں حیدرآباد کے احسانات ناقابل فراموش اور ناقابل تقلید ہے۔ نواب میر عثمان علی خان کا ذکر نہ کرنا غیر اخلاقی اور غیر فطری بات ہوگی۔ اسٹیٹ بینک کا قیام سے لے کر مہاجرین ہندوستان کی آبادکاری کے لیے حیدرآباد کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، حیدرآباد دکن نے ادب، سیاست، سماج، دینی حمیت، ثقافت، فنون لطیفہ، تعمیرات، تحقیق، تنقید، تخلیقی عمل، ادبی سرگرمیاں، اور فلاحی میدان میں جو خدمات انجام دیں ہیں وہ تاقیامت یاد رکھی جائیں گی۔

اس تقریب میں عمائدین شہر کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں شاہ مصباح الدین شکیل، پروفیسر عبدالمالک، محترمہ عطیہ موہانی، عبدالباسط، سید صبیح الدین، پروفیسر مسرور احمد قریشی، محمد فیصل جاوید، عبدالقادر، پروفیسر رضی راہی اور پروفیسر محمد آصف قادری علمی نے بھی شرکت کی۔ تقریب کی نظامت جناب حمید قریشی نے انجام دی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کا کتب خانہ قابل ذکر ہے کہ جہاں ۳۰۰۰۰ سے زائد کتب مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔ کتب خانے میں جناب محمد معیز، محمد مصطفیٰ اور حاصل مرادآبادی قارئین کو معلومات فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کتب خانے کے اوقات صبح ۹ نو بے سے شام ۴ بجے تک کے ہیں۔ اکیڈمی کے زیر اہتمام پورے سال متعدد تقاریب منعقد ہوتی ہیں جن میں دانشوران قوم اظہار خیال کرکے داد تحسین اور علم و فن کے عروج میں موثر اور متوازن کردار ادا کرتے ہیں۔

(رپورٹ: سید عاکف الدین)

حلقہ آہنگ نو کی ماہانہ تنقیدی نشست

گزشتہ دنوں حلقہ آہنگ نو کے تحت ماہانہ تنقیدی نشست سمن آباد میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ممتاز ادیبہ و افسانہ نگار محترمہ نسیم انجم نے کی جب کہ ناظم نشست شفیق احمد شفیق، مہمان خصوصی برطانیہ سے آئے ہوئے معروف شاعر ناظر فاروقی تھے، حسب پروگرام شاکر انور نے افسانہ ''انتظار'' پیش کیا۔ رازق عزیز نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ امید و بیم کے عالم میں انتظار کے کربناک لمحات کو افسانے میں موثر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کاوش عباسی نے کہا کہ ڈاکٹر اور ایک House Wife کو سپاٹ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناظم نشست شفیق احمد شفیق نے ڈاکٹروں کی خانگی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے جس میں صاحب افسانہ نے اپنے فنی چابکدستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ رؤف نیازی نے کہا کہ ایک خاتون کے احساسات کو افسانہ نگار نے اپنے طور پر بیان کیا ہے جب کہ کردار کے تعلق سے اظہار ہونا چاہیے۔ احمد صغیر صدیقی نے کہا کہ موضوع کے اعتبار سے ایک عام کہانی ہے۔ مگر مشاہدات اور ریاضت سے ایک کامیاب افسانہ بن سکتا تھا۔ محمد امین الدین نے کہا کہ ڈاکٹر کے انتظار اور وقت کے تعین میں تضاد ہے۔ احمد سعید فیض آبادی نے کہا کہ انتظار دراصل ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس میں صاحب افسانہ زندگی کے عصری مسائل کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اجمل اعجاز نے کہا کہ عورت اور مرد کی بے وفائی پر مشتمل حسب حال ایک اہم کہانی ہے۔ طاہر نقوی نے کہا کہ موضوع نیا نہیں ہے۔ جب کہ عام موضوع پر لکھنے کے لیے زیادہ ریاضت و مشاہدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس آنچ کی کمی ہے۔ محترمہ زیب النساز یبی نے کہا کہ عورت اور مرد کی وفاداری کے حوالے سے ایک موثر کہانی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔ سید فیاض علی نے کہا کہ شاکر انور کے سابقہ افسانوں کے تعلق سے یہ ایک کمزور تخلیق ہے۔ حامد علی سید نے کہا کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایک افسانہ نگار کی ہر کہانی شاہکار ہو۔ ایم الیاس اور انور فرہاد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ مہمان خصوصی ناظر فاروقی نے افسانے پر بے لاگ تبصرے کو صحت مند تنقید قرار دیا اور برطانیہ میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے حوصلہ افزا اور ہشت گفتگو کی۔ صدر نشست محترمہ نسیم انجم نے اپنے صدارتی خطاب میں مبصرین کی آرا کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ عورت اور مرد نہ تو سب بے وفا ہوتے ہیں نا باوفا۔ انتظار تو ہر عورت کا ایک نفسیاتی اور سماجی مسئلہ ہے۔ جس کو افسانہ نگار نے اپنے تخلیقی بساط کے مطابق موثر طور پر پیش کیا۔ دوسرے دور میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں ناظر فاروقی (مہمان برطانیہ)، احمد صغیر صدیقی، شفیق احمد شفیق، احمد سعید فیض آبادی، حامد علی سید، سید فیاض علی، سعد الدین سعد، انور فرہاد، رازق عزیز اور نشاط غوری کے نام شامل ہیں۔

(رپورٹ: احمد سعید فیض آبادی)

بنگلہ دیش کے اردو ادیب اور صحافی زین العابدین کے اعزاز میں کراچی میں تقریب

شکاگو (امریکا) میں مقیم اردو کے ممتاز ادیب اور کالم نگار، احتشام الدین ارشد نے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان علم و ادب کا گہوارہ تھا، وہاں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے گراں قدر کام ہوا لیکن سقوط مشرقی پاکستان کے بعد اردو زبان اور اردو بولنے والوں کے ساتھ جو صورت حال پیش آئی، وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کے باوجود بنگلہ دیش میں اردو زبان کا زندہ رہنا، ایک معجزہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے معروف ادبی ثقافتی تنظیم ''بزم سراج الادب کراچی'' کی جانب سے بنگلہ دیش میں مقیم اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور بزرگ صحافی زین العابدین کے اعزاز میں منعقدہ تقریب پذیرائی کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی، ایک مرتبہ پھر بنگلہ دیش میں اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کا بول بالا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ زین العابدین نے تمام زندگی اردو ادب اور اردو صحافت کے لیے وقف کردی ہے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی انھیں منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ صاحب اعزاز، زین العابدین نے اپنا مضمون ''بنگلہ دیش میں اردو کے اڑتیس سال'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اڑتیس سال ایک طویل مدت ہوئی ہے۔ ماضی کے دریچے سے دیکھیے اور ان نامساعد حالات کا تجزیہ کیجیے جن سے بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب اور ثقافت گزری، تو یہ یقین کرنا محال ہو جائے گا کہ اس کا زندہ رہ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ اس کے قتل کے سارے سامان مہیا تھے۔ مگر یہ ایسی سخت جان نکلی کہ اس پر چلنے والی تیغ کند ہوگئی۔ صدر تقریب ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی محمود شام نے کہا کہ زین العابدین ایک بے لوث انسان ہیں۔ انھوں نے ادب و صحافت کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس کے اعتراف کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قبل ازیں بزم سراج الادب کراچی کے روح رواں ممتاز شاعر سراج الدین سراج نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر محمود واحد، پروفیسر علی حیدر ملک، احمد زین الدین اور سائرہ غلام نبی نے بھی زین العابدین کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا۔ رشید خان رشید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ بعدازاں شعری نشست ہوئی۔ جس میں صاحب صدر محمود شام کے علاوہ جن شعرا نے کلام سنایا۔ ان میں فہیم ردولوی، صبا اکرام، سید نسیم الحسن زیدی، ڈاکٹر اختر ہاشمی، راشد نور، ریحانہ روحی، فیروز خسرو، ضیاء الحسن ضیاء، اختر سعیدی، یاور امان، ڈاکٹر نثار احمد نثار، پروفیسر نظیر سومرو، حیدر حسنین جلیسی، سراج الدین سراج، رضی عظیم آبادی، سحر علی، ابن عظیم فاطمی، سعد الدین سعد، رشید خان رشید، امتہ الحئ وفا اور سلطان مسعود شیخ شامل ہیں۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

رفعت سروش اور قیصر بھوپالی انتقال کر گئے

سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی کی اطلاع کے بموجب ہندوستان میں معروف ادیب رفعت انتقال کر گئے ادھر کراچی میں بزرگ شاعر سعید احمد خان قیصر بھوپالی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۷۴ برس تھی۔

پروفیسر آسی ضیائی رامپوری انتقال کر گئے

پروفیسر آسی ضیائی رامپوری کا ۱۴ر جنوری ۲۰۰۹ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم معروف شاعر، نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ آپ کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) کھوٹے سکے (افسانے اور ڈرامے وغیرہ)
(۲) کلام اقبال کا بے لاگ تجزیہ (طبع لاہور)
(۳) انجیل برناس کا اردو ترجمہ
(۴) رگِ اندیشہ (۱۹۹۴ء) مجموعہ نظم و غزل
(۵) حسرتِ نعت (نظمیں) ۱۹۷۲ء
(۶) داستان گو انیس (۱۹۹۷ء) انیس کی مرثیہ گوئی تجزیاتی مطالعہ
(۷) درست اردو
(۸) یادیں کچھ کرداروں کی
(ریاست رام پور کے بعض ناقابل فراموش کرداروں کا تذکرہ)
(۹) شب تاب چراغاں (۱۹۵۷ء)
(۱۰) تحسینِ اردو (شریک مصنف)
(۱۱) تاریخ زبان و ادب اردو (۱۹۹۲ء)
(۱۲) ڈنمارک میں سماجی بہبود (ترجمہ)

گزشتہ آٹھ برس سے ادبی ماہنامہ ''سیارہ'' کی مجلس ادارت کے صدر نشین تھے۔ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور میں تحقیقی کاموں اور تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں میں شریک رہے۔ ۱۹۸۷ء میں ادارہ علم و اب کے مرکزی دفتر میں اہم ذمے داریوں پر فائز رہے۔

آپ کا تعلق مرزا غالب کے شاگرد علاء الدین جلائی کے خاندان سے تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیص ہاشمی فرید آبادی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں مستقل رہائش اختیار کی۔ تدفین علامہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں ہوئی۔

یوں جلوہ کناں روز ہیں مے خانے سے باہر
خورشید ہو یوں مشرق کے کاشانے سے باہر

طوفانِ اشک غم تو کبھی کا فرو ہوا
آندھی مگر جفا کی ابھی تک تھمی نہیں

محبت میں مجھے اندیشۂ سود و زیاں کیوں ہو
بنے جو شاخِ نازک پر وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ترے جلوے اگر آزاد ہیں قید تعین سے
جبیں میری بھی پھر پابند سنگ آستاں کیوں ہو

جو اپنا بڑا پھونک چکے، کیا ان کو سنائے یاد وطن
آگے جو قدم اٹھ جاتا ہے خاک اُڑ کے ہوا ہو جاتی ہے

(رپورٹ: پروفیسر ظفر حجازی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور)

آرٹس کونسل میں انجمن ترقی اردو کی کتب اور رسائل کا میلہ

آرٹس کونسل میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کی جانب سے ۱۱/مارچ ۲۰۰۹ تا ۱۴/مارچ ۲۰۰۹ ایک کتب میلے کا اہتمام کیا گیا۔ جس کا افتتاح ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی محترمہ شہلا رضا نے کیا۔ اس کتب میلے کے انعقاد کے لیے آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی نیز ذیلی ''ٹاک شو'' کمیٹی کے عہدے داران بالخصوص کالم نگار و افسانہ نویس حسن ظہیر اور معروف شاعر نقاش کاظمی صاحبان کا تعاون شامل تھا۔

آرٹس کونسل نے اپنی جگہ انجمن ترقی اردو کو اس لیے فراہم کی تھی تاکہ انجمن ترقی اردو کی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ فروخت کی جاسکے۔ واضح رہے کہ آرٹس کونسل ایسی جگہ ہے جہاں نہ صرف فنون لطیفہ سے متعلق افراد اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں بلکہ مہمان حضرات بھی خاصی تعداد میں تشریف لاتے ہیں۔ آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے مذکورہ ارکان کی دلچسپی اور تعاون سے انجمن ترقی اردو کو کتابوں کی فروخت کے لیے ایک مستقل گوشہ بھی فراہم کیے جانے کی تجویز ہے۔

(رپورٹ: ادارہ)

اشاریۂ اردو

مرتب

مصباح العثمان

صفحات: ۱۸۰ قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی خدمات

از

شہاب الدین ثاقب

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مفصل حیات اور زبان و ادب کے سلسلے میں کی
جانے والی ادبی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

شہاب الدین ثاقب نے اس وقیع کام کو پوری تندھی سے سرانجام دیتے ہوئے بابائے اردو
کا نہ صرف مرقع پیش کیا ہے بلکہ اُن کی علمی و ادبی خدمات کو ایک جامع حیثیت میں بھی مرتب کیا ہے۔
بابائے اردو شناسی میں یہ کتاب اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بیاضِ مراثی

اشاعت دوم

گیارہویں، بارہویں صدی ہجری کے مراثی کا مجموعہ

مرتب: افسر صدیقی امروہوی

صفحات: ۲۷۰ قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270

Phone: 4811406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

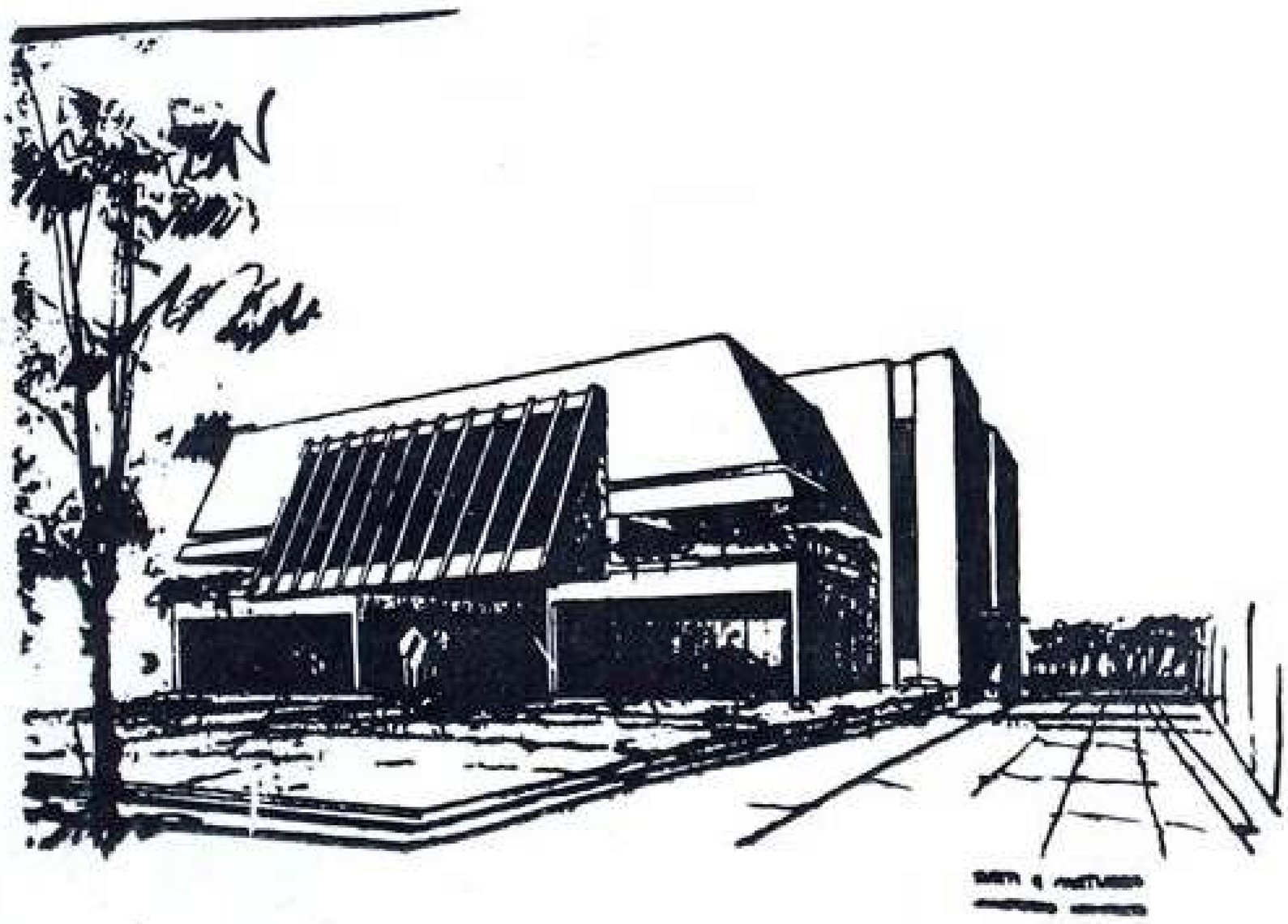

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

ڈاکٹر ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، نے انجمن ترقی اردو پاکستان (ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی) کے لیے احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی سے شائع کیا۔